قرآنی نظامِ ربوبیت کا نقیب

طلوعِ اسلام

مئی 1973

اقبال اور دو قومی نظریہ

مساواتِ محمدی

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی، گلبرگ ۲، لاہور

بدل اشتراک

پاکستان

سالانہ —— دس روپے

غیر ممالک

سالانہ —— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ

جلد (۲۶) — مئی سنہ ۱۹۷۳ء — نمبر (۵)

فہرست

۱۔ لمعات — ۴

۲۔ بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں — ۱۳

۳۔ رابطہ باہمی — ۱۴

۴۔ اقبالؒ ۔ اور ۔ دو قومی نظریہ (محترم پرویز صاحب) — ۱۷

(۵) مجلس مذاکرہ ۔ (۲) ۔ (طلوعِ اسلام کنونشن ۷۳ء) — ۴۱

(۶) حقائق و عبر ۔ (کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا) (آزادیٔ افکار)
(خدا کے مقربوں کی نشانیاں) (پرائیویٹ اور پبلک ضابطۂ اخلاق)
(بہت تنگ کئے باقی جو ہیں ۔۔۔) (یہ بھی جاری ہی کوشش کا نتیجہ ہے) — ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر ... ۔ مقام اشاعت [illegible] لاہور ... مطبوعہ ...

میں ایک گھنے ٹھنڈے سائے سے محروم ہو گیا

(پرویز)

مبدا کریم نے میرے حال پر جو نوازشہائے بے پایاں ارزانی فرمائی ہیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ میری اماں جی ابھی تک بقیدِ حیات تھیں۔ ان کی عمر سو سال سے زیادہ تھی لیکن ان کے قویٰ مضبوط، حواس قائم اور کچھ عرصہ پہلے تک، حافظہ مربوط تھا۔ وہ میرے ننھیال اور ددھیال دونوں اطراف سے معزز گھرانے کی خاتون تھیں۔ تھیں تو اَن پڑھ لیکن نہایت مدبّر اور سلیقہ شعار ہونے کی بنا پر زندگی کے عملی تجارب سے جو کچھ انہوں نے پایا اور محفوظ رکھا وہ ایک انمول خزانہ تھا۔ اس اعتبار سے وہ اگر ایک صدی نہیں تو کم از کم، اسّی نوّے سال پر پھیلے ہوئے ماضی کی تاریخِ ناطق تھیں۔ ان کی وفات سے ایک عہد گم ہو گیا۔ میری ابتدائی زندگی میں ہمارا گھرانہ مساعد و نامساعد حالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ لیکن یہ ان کی تربیت تھی جس نے مجھے ان تغیرات سے قطعاً متاثر ہونے نہ دیا اور میں (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) "با اضطرابِ موج سکونِ گہر" کی سی کیفیت لئے پروان چڑھا۔ مجھ میں اگر کوئی اچھائیاں ہیں تو وہ میرے دادا جان مرحوم کی تعلیم اور اماں جی کی تربیت کی رہینِ منت ہیں۔ اس سے بھی بڑی بات ایک اور ـــــ وہ راجپوت گھرانے کی بیٹی اور بہو تھیں جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی کئی پشتوں تک "رام جاتے ہی جاتا ہے، رحیم آتے ہی آتا ہے۔" ان کے بیشتر معتقدات اور رسوم و رواج ہندوانہ ہی رہتے ہیں۔ باپ کے گھر کی یہ فضا، سسرال میں آئیں تو اس گھرانے میں پیری مریدی اور قبر پرستی انتہائی شدت کی تھی۔ میری زندگی کا یہ ابتدائی دور انہی فضاؤں کی تخلیق تھا۔ زندگی کے دوسرے دور میں جب میں نے ان خیالات اور مسالک سے اجتناب ہی نہیں برتا بلکہ (قرآنی روشنی میں ان سے) بغاوت اختیار کی تو مجھے ڈر تھا کہ وہ اس میں سخت مزاحم ہوں گی۔ لیکن انہوں نے اسے نہایت کشادہ ظرفی سے برداشت کیا، اور میرے حق میں دعائے خیر سے زیادہ کبھی کچھ نہ کہا۔ اس طرح انہوں نے میری زندگی کے اس راستے میں کبھی کوئی ناہمواری یا کشمکش پیدا نہ ہونے دی ـــــ یہ بھی ان کا مجھ پر بہت بڑا احسان تھا۔

جو لوگ "مشترکہ برادری" کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں کس قدر الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان الجھنوں کا سلجھانا میرے بس کی بات نہیں تھا لیکن اماں جی کی موجودگی میں مجھے ان کی کوئی فکر ہی نہ تھی۔ جو الجھن پیدا ہوتی وہ اپنے طویل اور پختہ تجربہ کی بنا پر اسے نہایت آسانی سے حل کر دیتیں۔ میں اگر کسی معاملہ میں دخل دیتا تو وہ خفیف سی محبت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہہ کر مجھے چپ کرا دیتیں کہ "کاکا! ساریاں گلاں کتاباں وچ ای لکھیاں ہویاں نئیں ہُندیاں۔" (بیٹا! تمام باتیں کتابوں میں ہی لکھی نہیں ہوتیں)۔

ان مختصر سی تصریحات سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ میں جو فکری اعتبار سے اتنا کچھ کر پایا ہوں تو اس میں ان اَن پڑھ اماں جی کا کس قدر ہاتھ تھا۔ اب آخری زندگی میں ان کی کیفیت اس صد سالہ برگد کے پیڑ کی سی تھی جس کے سایہ میں تپتی ہوئی دوپہر کے ستائے ہوئے پرند چرند حیوان انسان سکون کا سانس لینے کے لئے آ بیٹھتے ہیں۔ یہ پیڑ ۳۰ مارچ کی صبح یکایک گر پڑا۔ اور بیشتر خورد، بعض وہ نفوس ان کے سائے سے محروم ہو گئے۔ ان میں سرِفہرست

یہ حرماں نصیب ہے۔ خدا مرحومہ کو اپنے سحابِ کرم کے سائے میں رکھے۔

میں اس سانحہ کی خبر طلوعِ اسلام میں شائع نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ یہ میرا ذاتی المیہ ہے لیکن محترم ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے ایک اپیل "طلوعِ اسلام میں اشاعت کے لئے بھیجی۔ اس سے میں ان سطور کی اشاعت پر مجبور ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تجویز کے سلسلہ میں عرض ہے کہ اماں جی کی وفات کے بعد اب ہمارے خاندان میں کوئی بزرگ ایسا نہیں رہا جو میرے بچپن کے حالات سے واقف ہو۔ ان سے تو اب میں ہی واقف ہوں (میرے والد مدت ہوئی انتقال کر چکے ہیں)۔ اپنی "آپ بیتی" قلمبند کرنے کا سوال خود میرے پیشِ نظر ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ اگر میرے بعد کوئی اور راہرو ان راستوں پر چلنا چاہے تو اسے معلوم ہو کہ ان میں کون کونسے خطرناک مقامات آتے ہیں اور ان سے بعافیت کیسے گذرا جا سکتا ہے۔ میں اپنی قرآنی فکر کے سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں لیکن ابھی تک مجھ پر وہ ایک "قرضہ" باقی ہے۔ ان سے سبکدوش ہو جاؤں تو پھر اس مجوزہ "آپ بیتی" کی طرف متوجہ ہوں گا۔ اگرچہ ہو سکتا ہے کہ اس کی اشاعت کا موزوں وقت میرے بعد آئے۔ یہ بہرحال بعد کی بات ہے۔ اسی میں یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ مائیں کس طرح "سیرتِ اقوام کی صورت گر" ہو سکتی ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب کا گرامی نامہ درج ذیل ہے۔

محترم پرویز صاحب کی والدہ محترمہ کا ماہ حال میں انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ مجھے اُن کی موت کا دوہرا صدمہ ہوا۔ اول اس لئے کہ وہ میرے محسن پرویز صاحب کی والدہ تھیں۔ دوئم اس لئے کہ میری دیرینہ آرزو تھی کہ پرویز صاحب کے حالاتِ زندگی کو ایک کتاب کی شکل میں ترتیب دوں۔ اس سلسلہ میں والدہ مرحومہ سے پرویز صاحب کے بچپن کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ افسوس کہ غفلت کیوجہ سے یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ لیکن اس واقعہ سے میرا یہ احساس شدید ہو گیا کہ چونکہ انسانی زندگی کا بھروسہ نہیں اس لئے جس کام کا ارادہ کر چکا ہوں اس کا جلد از جلد پورا کرنا ہی بہتر ہوگا۔ سردست میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کام کو کب شروع کروں گا اور کب تک ختم کر سکوں گا کیونکہ حال ہی میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے بعد جو فارغ وقت مجھے ملتا ہے اسے ایک نئی تصنیف (CONSPIRACIES AGAINST THE QURAN) میں صرف کر رہا ہوں۔ لیکن بہرحال محترم پرویز صاحب کا (BIODATA) جلد فراہم کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں دیگر احباب کی مدد کا بھی طلبگار ہوں۔ پرویز صاحب کی تعلیمات کے متعلق تو خود بھی کچھ نہ کچھ اپنی بساط کے مطابق لکھ سکوں گا اور دیگر گوشوں سے بھی اس کا خیر مقدم کروں گا۔ لیکن اس کے علاوہ ان کے حالاتِ زندگی کے متعلق جملہ احباب سے بالعموم اور پرویز صاحب کے اہلِ خانہ اور ان کے دیرینہ احباب سے بالخصوص گزارش ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مواد مہیا کرنے کی کوشش کریں۔ میں ان کا شکر گزار رہوں گا۔

انسان کے کسی عمل کا آغاز تو اس کے ارادہ سے شروع ہو جاتا ہے لیکن انجام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ۔

مخلص

عبدالودود۔ ۳۲۔ نسبت روڈ۔ لاہور

۹ اپریل ۱۹۷۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ ہماری نئی نسل (کہ جس سے آج کی پاکستانی قوم عبارت ہے اور جو مستقبل کی قوم کے طائران پیش رس ہیں) کی مملکتِ پاکستان کی اہمیت سے بیگانگی اور بے راہ روی کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے انہیں بتایا ہی نہیں کہ تحریکِ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور کیا اور کیوں دیا تھا۔ قائداعظمؒ نے اس کے لئے اس قدر جد و جہد کیوں کی تھی۔ ہم نے اپنے لئے ایک الگ مملکت کا تقاضا کیوں کیا تھا۔ اس مملکت سے مقصود و مطلوب کیا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ تحریکِ پاکستان کی ایک مستند تاریخ مرتب کی جاتی۔ پیغامِ اقبالؒ کی وضاحت کی جاتی اور قائداعظمؒ کی قابلِ اعتماد سوانح حیات شائع کی جاتی۔ پھر ان کتابوں کو ہماری درسگاہوں میں بطور نصاب پڑھایا جاتا۔ ہم نے ان میں سے کچھ بھی نہ کیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہماری جدید نسل کو یا تو کچھ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا، اور اگر معلوم ہو سکا تو صرف اس قدر کہ یہ محض معاشی مسئلہ تھا۔ ہندو کی تنگ نظری نے مسلمانوں پر حصولِ دولت کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ قائداعظمؒ نے پہلے کوشش کی کہ ہندو کے ساتھ رہتے ہوئے مسلمان ملک کی دولت سے اپنا حصہ لے سکیں، اور جب انہوں نے دیکھا کہ ہندو اس پر رضامند نہیں ہوتا تو انہوں نے علیحدگی کا مطالبہ پیش کر دیا جسے انگریز کی تفرقہ انگیز پالیسی نے ہوا دی، اور یوں مملکتِ پاکستان وجود میں آ گئی۔ اس پس منظر میں ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ سوچتا ہے کہ ہماری جداگانہ مملکت کا محرک جذبہ معاشی تھا، لیکن قیامِ مملکت کے بعد ہوا یہ کہ ملک کی دولت چند خاندانوں میں سمٹ کر رہ گئی اور عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف ہم نے اس علیحدگی سے جو ہندو کی مستقل مخالفت مول لے لی تو یہ بھی ہمارے لئے ہزار مصیبتوں کا موجب بن گئی۔ بنابریں، وہ سوچتا ہے کہ ہم نے اپنی الگ مملکت کی تشکیل سے کمایا کیا! اس کے بعد اس کی سوچ کا اگلا قدم یہ ہوتا ہے کہ علیحدگی کے مطالبہ سے قائداعظمؒ نے سخت غلطی کی۔ اب اس غلطی کے ازالہ کا طریق یہ ہے کہ ہم پھر سے بھارت کے ساتھ مل کر ایک ہو جائیں، اور اگر علیحدہ ہی رہنا ہے تو اپنے ہاں سوشلزم کا نظام رائج کریں۔ ہماری موجودہ قوم اس نسل کی پہلی پود پر مشتمل ہے اور "ہنوز" پرانے بادہ کشوں میں سے کچھ لوگ باقی ہیں جو ماضی کے قصے دہراتے رہتے ہیں۔ جب یہ لوگ بھی اٹھ گئے، اور دوسری طرف اس نژادِ نو کی ایک آدھ پود اور بڑھ گئی تو ہمیں خطرہ ہے کہ مملکتِ پاکستان کے صحیح محرکات کا ذکر تک کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ یہ وجہ ہے جو ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس مملکت کی بقا چاہتے ہو تو اپنی ابھرنے والی نسلوں کو اس کے صحیح محرکات سے آگاہ کرو۔ ہماری اس صدا پر کہیں سے لبیک کی آواز نہ سن کر اکثر احباب تقاضا کرتے ہیں کہ اس اہم اقدام کے لئے جب کوئی اور آمادہ نہیں ہوتا تو اسے خود طلوعِ اسلام اپنے ہاتھ میں کیوں نہیں لے لیتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ یہ احباب بہ تکرار و اصرار کہتے رہتے ہیں) طلوعِ اسلام

شروع سے اس تحریک کے ساتھ رہا ہے ـــ اور ساتھ بھی رہا ہے دینی تقاضا کی بنا پر ـــ اس لئے وہ اس باب میں یہ اہم خدمت سرانجام دے سکتا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ کام انفرادی طور پر کئے جانے کا نہیں۔ یہ حکومتی سطح پر ہی سرانجام پا سکتا ہے۔ اسلئے کہ اس کے لئے جس قدر وسیع وسائل، ذرائع اور مواد کی ضرورت ہے وہ حکومتی تعاون کے بغیر میسر نہیں آ سکتے۔ یہ وجہ ہے جو ہم اربابِ حکومت سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ وہ مملکت کی اس بنیادی ضرورت کی طرف متوجہ ہوں۔

اس مسئلہ کی اہمیت کے متعلق اعیانِ حکومت کی طرف سے بھی کبھی کبھی آواز سنائی دی جاتی رہی ہے لیکن معاملہ ہمیشہ جرسِ کارواں تک رہا۔ رحیلِ کارواں کی نوبت آج تک نہیں آئی یعنی ان کی طرف سے عملاً آج تک کچھ نہیں کیا گیا۔ اب صدر بھٹو نے ۱۳ اپریل کو اسلام آباد میں پاکستان ہسٹری کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے وہ خاص توجہ کا متقاضی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اسے اپنے لمعات کا موضوع قرار دیا ہے۔ یہ خطاب عالمانہ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے اس خطاب میں فرمایا۔

> اگر ہم نے پاکستان میں اپنی تاریخ کو فراموش کر دیا تو ہم نہ اپنے حال کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے اور نہ ہی مستقبل کی تنظیم کر سکیں گے ...... میں تو یہاں تک بھی کہوں گا کہ تخلیقِ پاکستان کی منطقی علت کی جڑیں تاریخ کی سرزمین میں پیوست تھیں۔

تحریکِ پاکستان کی تاریخی اہمیت کو اس طرح واضح کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ

> اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ تحریک محض ماضی کے احیا کی ایک کوشش تھی جس سے مقصد یہ تھا کہ ہمارے عہدِ گذشتہ کے کھنڈرات پر جو مرورِ زمانہ کی مٹی کی تہیں جم چکی تھیں، انہیں الگ کر کے، اپنے جذبہ قدامت پرستی کی تسکین کر لی جائے۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک لوگوں کے دلوں میں تاریخی شعور بیدار نہ کیا جاتا، اس تحریک کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑ نہیں سکتا تھا۔[1]

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ جو تاریخ ہماری درسگاہوں میں پڑھائی جاتی ہے وہ کس قدر بے مقصد، سطحی اور غیر مربوط ہے

> تحریکِ پاکستان کے متعلق جو کچھ طالب علموں کو بتایا جاتا ہے وہ ایک آزاد مملکت کے حصول کے سطحی مقاصد تک محدود ہوتا ہے۔

بجا اور درست۔ تحریکِ پاکستان کی مروجہ تاریخ کا یہی وہ بنیادی سقم اور نقصان رساں غلطی ہے جس کی طرف ہم سالہاسال سے توجہ مبذول کراتے چلے آ رہے ہیں لیکن اس کے بعد صدرِ محترم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بڑی گہری فکر کا متقاضی ہے۔ انہوں نے کہا کہ طالب علموں کو اس تحریک کے محض سطحی محرکات سے روشناس کرایا جاتا ہے

> لیکن وہ معاشرتی اور معاشی تقاضے جنہوں نے مسلمانانِ ہند کو علیحدگی کے مطالبہ پر مجبور کر دیا تھا، تاریخ کی روشنی میں ان کی وضاحت آج تک نہیں کی گئی۔

آپ نے غور فرمایا کہ صدر بھٹو نے بھی معاشرتی اور معاشی تقاضوں کو تحریکِ پاکستان کے محرکات قرار دیا ہے (اس نکتہ پر ہم ذرا آگے چل کر تبصرہ کریں گے)۔ آگے چل کر انہوں نے اس میں ایک اور عنصر کا بھی اضافہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو مملکتیں

---

[1] صدر بھٹو کے خطاب کا جو متن پاکستان ٹائمز کی ۱۳ اپریل کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، اس میں اکثر مقامات پر زبان اس قدر جامع استعمال ہوئی ہے کہ ہم اس کے رواں ترجمہ پر مجبور ہیں۔

محض جغرافیائی حدود کی بنا پر وجود میں آتی ہیں، ان کے قومی تشخص کی کیفیت اور ہوتی ہے۔ لیکن

ہمارے جیسی قوم، جسے کلچر (ثقافت) کی بنیاد پر ایک وسیع جغرافیائی وحدت سے الگ کیا گیا تھا، اس مسئلہ کا اس کے وجود کے ساتھ اساسی تعلق ہوتا ہے۔

یہاں انہوں نے "کلچر" کو تیسرا جذبۂ محرکہ قرار دیا ہے۔ اس "کلچر" کی وضاحت انہوں نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

ہماری قوم کی تشکیل اسلام کے مذہبی کلچر کی رُو سے ہوئی ہے۔ اس اسلامی کلچر کی رُو سے جس نے پہلے ایرانی اثرات کو اپنے اندر جذب کیا پھر اس نے ہندوستان کے معاشرتی ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کیا، اور آخرکار، وہ مغربی تہذیب کے ان برق آسا عناصر سے متاثر ہوا جو برطانوی استعمار کے ساتھ یہاں آئے۔

یعنی ان اثرات کے امتزاج کا نام تھا وہ اسلامی کلچر جس سے ہمارا قومی تشخص وجود پذیر ہوا تھا، اور جو مطالبۂ پاکستان کے محرکات میں تیسرا عنصر تھا ۔۔ بالفاظ دیگر، ان محرکات کے اقنوم ثلاثہ تھے معاشی اور معاشرتی تقاضے اور اس قسم کا اسلامی تشخص۔ اسلام کے متعلق اس خطاب میں کہا گیا ہے کہ:۔

اسلام خدمتِ (خلق) کا مذہب ہے اور تمام مذاہب میں سب سے زیادہ سیکولر۔ اسلامی ثقافت (کلچر) نے اپنی توانائی اُس تجرباتی اندازِ فکر سے حاصل کی جو تمام علوم سائنس کا سرچشمہ ہے اور جس کی قرآن نے اس قدر تاکید کی ہے۔ لیکن ہم نے اسلام کو جہالت کی تاریکیوں کا ایجنٹ اور استحصال کا ذریعہ قرار دے کر اس سے بڑی دشمنی برتی ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام انسان خدا کے حضور یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن (سوال یہ ہے کہ) کیا ہماری معاشرتی عملی زندگی اس مساواتِ انسانیہ کی آئینہ دار ہے؟ اگر (قول اور عمل کے اس) تضاد اور ثنویت کا دور کرنا مقصود ہے تو معاشرتی مؤرخ کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ آگے بڑھے اور مرض کے اسباب کی تشخیص کرے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کچھ شب بھر میں ہو جائیگا اس مقصد کے حصول کے لئے برسوں کی فکری کاوش اور کوشش کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اگر ہم اس کام کو شروع کر دیں تو یہ امر بھی ہمارے لئے باعثِ تسکین ہوگا۔ لیکن اس قسم کا آغازِ کار گہرے احتسابِ خویش کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اسلام نے جس تجرباتی اندازِ فکر (EMPIRICAL ATTITUDE) پر زور دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم عقلی تجربات کی رُو سے زندگی کے اصول و اقدار متعین یا دریافت کریں۔ یہ اصول و اقدار ہمیں وحی کے ذریعے مل چکے ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ان اصول و اقدار کو عمل میں لا کر ان کے مبنی بر صداقت ہونے کا ثبوت پیش کریں۔ صدر محترم نے جو کہا ہے کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے قول اور عمل میں جو تضاد ہے اُسے دور کیا جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کی بھی مراد ہے کہ قرآنی اصولِ حیات اور اقدار کے متعلق ہم جو دعاوی زبان سے کرتے ہیں، ان پر عمل کر کے ہم اپنے دعاوی کی تصدیق کریں۔ یہی قرآن کی تعلیم اور تاکید ہے۔

اب پھر موضوعِ پیشِ نظر کی طرف آیئے۔ مطالبۂ پاکستان کے محرکات کے متعلق صدر محترم نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ (ان کے نزدیک) یہ محرکات، معاشرتی اور معاشی تقاضے اور وہ اسلامی کلچر تھا جو ایرانی، ہندوستانی،

اور تہذیب مغرب کے مؤثرات کا امتزاج تھا۔ ان محرکات کو متعین کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ

اس فوری ضرورت کے پورا کرنے کے لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تاریخی اور ثقافتی ریسرچ کے لئے ایک نیشنل کمیشن کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ اس کمیشن کے ذمے یہ فریضہ عاید کیا جائے کہ

(۱) وہ برصغیر میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کے سرچشمہ اور اس کی تکمیل (کے عوامل) کی تشخیص کرے ان (کی اہمیت کا) اندازہ لگائے۔ اس کی صحیح صحیح تعبیر پیش کرے اور اسے نمایاں اور اجاگر کرکے سامنے لائے۔

(۲) ایسا کرنے میں وہ اس کے نفسیاتی پس منظر اور ان معاشرتی اور معاشی تقاضوں پر خاص طور پر زور دے جن سے مجبور ہو کر یہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔

(۳) دنیا کی عالمگیر تحریکوں کے سلسلہ میں اس کی روش متعین کرے اور یہ بتائے کہ ہم عصر اقوام میں اس کا مقام کیا ہے۔

(۴) دنیائے اسلام کے ساتھ اس کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ اور

(۵) ایشیائی اور غیر ایشیائی سوسائیٹیوں کے ساتھ اس کے روابط کی نوعیت کیا ہوگی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس مقصد کے لئے یہ کمیشن ملک کے چیدہ اور سربرآوردہ ماہرین کی خدمات حاصل کرے گا اور ان تمام اداروں کی نگرانی کرے گا جو اس قسم کی ریسرچ کے کاموں میں مصروف ہیں۔ اور ان میں باہمی ربط و ضبط پیدا کرے گا۔

ہم صدر مملکت کے اس جذبہ کی قدر کرتے ہیں جس کے تابع انہوں نے کسی ریسرچ کے لئے کمیشن مقرر کرنے کی ضرورت محسوس کی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مجوزہ کمیشن نہ صرف یہ کہ ان محرکات کی نشاندہی نہیں کر سکے گا جو تحریک پاکستان کی بنیاد تھے بلکہ یہ ان غلط (مزعومہ) محرکات کی گرہیں اور مضبوط کر دے گا جو اس وقت ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں راسخ ہیں اور جن کی وجہ سے وہ ہماری علیحدگی کی تحریک ہی کو ایک غلط اور نقصان رساں اقدام قرار دیتے ہیں۔ صدر محترم نے اپنے خطاب میں اس امر کی نشاندہی کر دی ہے کہ یہ محرکات معاشرتی اور معاشی تقاضے (بلکہ مجبوریاں) تھیں یا زیادہ سے زیادہ اس کلچر کا تحفظ جو مختلف تہاذیب کے امتزاج سے وجود میں آیا تھا۔ اور جسے اسلامی کلچر کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ہمارا نوجوان طبقہ پہلے ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ ہندو کی تنگ نظری کی پیدا کردہ معاشرتی اور معاشی مجبوریاں تھیں جن سے جھنجھلا کر ہم نے علیحدگی جیسا سنگین قدم اٹھایا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر آج بھی ہندو ہم سے کشادہ ظرفی کا وعدہ کرے اور ہمیں معاشرتی اور معاشی تحفظات کا یقین دلا دے تو ہم اس کے ساتھ مل جانے کو تیار ہو جائیں گے۔ ملک میں ایسے عناصر پہلے ہی موجود ہیں جو اس نقطۂ نظر کو ہوا دے رہے ہیں۔ اگر کمیشن نے اپنی "ریسرچ" کے بعد اس کی تائید و تصدیق کر دی تو یہ "اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ" ہو جائے گا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ صدر مملکت ایسا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ ایسا چاہیں یا نہ چاہیں جن خطوط کے مطابق اس کمیشن کی ضرورت کا اعلان کیا گیا ہے اس کا نتیجہ بہرحال ایسا ہی ہوگا۔

باقی رہا کلچر کا معاملہ، سو ہمارے ہاں کے "کلچر" کے سپیشلسٹ پہلے ہی موہنجو داڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کو پاکستانی کلچر

کے آئینہ دار قرار دیتے اور ان کے مظاہر کو بڑے فخر سے مغربی سیاحوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس پر ہمارا نوجوان طبقہ (بجا طور پر) کہتا ہے کہ اگر یہی ہمارا کلچر ہے تو اس کی حفاظت ہندوستان کے ساتھ رہتے ہوئے' اور بھی بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریک پاکستان کا جذبہ محرکہ ایک اور صرف ایک تھا۔ اور وہ یہ کہ ہمارا معیار قومیت' ایمان کا اشتراک ہے' اور اپنی آزاد مملکت کے بغیر اسلام ایک زندہ حقیقت بن نہیں سکتا۔ ہمارے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی مخلوط مملکت میں ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ یہ تھی ہماری "مجبوری" جس کے ماتحت ہم نے ایک الگ آزاد مملکت کا مطالبہ کیا تھا۔ اور یہی ہے ہماری وہ "مجبوری" جس کے ماتحت ہم اس مملکت کو الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو نہ قوم کا "مذہب گزیدہ" نوجوان طبقہ سمجھتا ہے' نہ مذہب کا پرستار بلکہ اجارہ دار "مولوی صاحبان" کا گروہ۔ نوجوان طبقہ کے نزدیک مذہب تمام خرابیوں کی جڑ ہے' اس لئے اسے سیاست سے الگ رکھنا چاہیئے۔ قدامت پسند مذہبی پیشوائیت کے نزدیک بالعموم مذہب نام ہے چند عقائد' عبادات اور پرسنل لاز کا۔ ان امور کا تحفظ مل جائے تو پھر انہیں اس سے غرض نہیں کہ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت رہتی ہے یا نہیں۔ ان میں سے جو لوگ مذہب کو سیاست کے دائرہ میں بھی دخیل کار سمجھتے ہیں' ان کا مقصد یہاں تھیاکریسی قائم کرنا ہے۔ یعنی وہ "خدا کے نام پر" اقتدار مملکت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ باقی رہے ارباب حکومت' سو یہ کہنا زیادتی ہوگا کہ اس پچیس سال کے عرصہ میں' ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو دین کی اس بنیادی حقیقت سے واقف نہ ہو۔ ان میں ایسے تھے جو جانتے تھے کہ صحیح اسلام کیا ہے۔ لیکن وہ ملّا کے پراپیگنڈے سے ڈرتے تھے اس لئے اسے کھلے بندوں زبان پر یا عمل میں لانے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ ملّا سے (اس ضمن میں) بنیادی طور پر مراد جماعت اسلامی ہے۔

جوابی پراپیگنڈہ ہی نہیں کرتی معاشرہ میں خلفشار بھی پیدا کرتی رہتی ہے۔ ہماری دیانتدارانہ رائے ہے کہ پاکستان میں صحیح اسلامی نظام کے قیام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ جماعت اسلامی کا وجود ہے۔ ملک کو اس جماعت کی فساد انگیزیوں اور فتنہ سامانیوں سے محفوظ رکھنے کا احساس تھا جو مخلص نفوس کو دین خالص پر مبنی نظام کے اعلان سے روک دیتا تھا۔ انہی کی خوفہ آرائیوں کا ڈر (یا مودودی صاحب کے الفاظ میں چوہدری محمد علی صاحب کے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات) تھے جن کی وجہ سے ۱۹۷۳ء کا آئین مفاہمتوں (COMPROMISES) کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق اور فرقوں کے وجود کو ختم کر دیا گیا تھا لیکن اس کے خلاف انہوں نے قیامت برپا کر دی اور اس وقت تک چین نہ لینے دیا جب تک ان تمام شقوں میں اپنی مرضی کے مطابق ترمیم نہ کرا لی۔ عائلی قوانین' خاندانی منصوبہ بندی جیسے فروعی مسائل کو انہوں نے اسلام کی بنیادی حقیقت قرار دے کر جس شد و مد سے شور مچایا اس کی صدائے بازگشت سے آج تک فضا لرزاں ہے۔ زرعی اصلاحات کا سوال آیا تو انہوں نے شور برپا کر دیا کہ زمین تو ایک طرف' کسی قسم کی ذاتی ملکیت پر پابندی' اسلام کے خلاف ہے۔ ضروری تنصیبات کو قومیانے کا مسئلہ پیش ہوا تو انہوں نے اسے ابلیس کا ایجاد کردہ انسانیت کش نظام قرار دے دیا۔ ملک میں پارلیمانی نظام رائج کرنے کی تجویز پیش ہوئی تو انہوں نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ اسلامی نظام میں صدر کو ویٹو کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ جب صدارتی نظام قائم کرنے کی تجویز پیش آئی تو انہوں نے "بحالیٔ جمہوریت" کی تحریک کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ صدر ایوب کے مرتب کردہ دستور کے خلاف یہ کہہ کر ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ ایک فرد کا مرتب کردہ آئین قابل قبول نہیں ہو سکتا' اور جنرل یحییٰ خان کے زیر تدوین دستور کے متعلق (اسے دیکھے بغیر) یہ ارشاد فرما دیا کہ اس سے وہ اس خلافت راشدہ کا احیاء کریں گے جس کا سلسلہ شہادت حضرت علیؓ کے بعد منقطع ہو گیا تھا۔ صدر بھٹو کو

یہ کہہ کر ستراوارِ جہنم قرار دیا کہ وہ سوشلزم کا حامی ہے۔ اور خود اس ولی خاںؔ سے رشتۂ اتحاد وابستہ کر لیا جو نہ صرف سوشلزم کا حامی ہے بلکہ سیکولر نظام کا سب سے بڑا داعی اور متحدہ قومیت کا نقیب ہے۔ یہ ہیں اس جماعت کی فتنہ سامانیوں کی چند ایک مثالیں جن کی بنا پر یہاں کسی نے صحیح دینی نظام کے قیام کی جرأت نہیں کی۔

یاد رکھیے، جس مقصد کے لئے مملکتِ پاکستان حاصل کی گئی ہے' اسے صرف وہ لوگ سمجھ سکیں گے جو:

(۱) دین اور مذہب کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔

(۲) یہ جانتے ہوں کہ اسلام' دین ہے۔ مذہب نہیں۔

(۳) جنہیں بدلائل و براہین معلوم ہو کہ اسلام مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اسلئے ان دونوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوگی۔

اور اس نظام کو قائم وہ کر سکے گا جو اپنی بے لوث اصول پرستی اور بلندیٔ سیرت و کردار کی بنا پر عوام کی نظروں میں اس قدر محبوب ہو کہ مذہبی پیشوائیت (عوام کے خوف سے) اس کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہہ سکے' اور اگر کوئی ایسی بات کہے تو عوام اُسے سننے کے لئے تیار نہ ہوں۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں تاریخی ریسرچ سے مقصد صرف یہ ہونا چاہیئے کہ دین کا یہ تقاضا ہمارے ہاں کب اور کیسے ابھرا۔ (علامہ) اقبالؒ نے اس سلسلہ میں کیا کچھ کیا۔ قائداعظمؒ نے اس شمع کو کس طرح اپنے ہاتھ میں لیا۔ انگریز، ہندو اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت نے اس کی کس طرح مخالفت کی۔ جماعتِ اسلامی کا اس باب میں کیا کردار تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان میں سے کون کون سے عناصر یہاں آ گئے اور وہ آج تک کس کس انداز سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں ——— خود مملکتِ پاکستان اور اس میں دین کے نظام کے قیام کی مخالفت۔

اس مقصد کے لئے کسی کمیشن کا تقرر تو مفید مقصد خدمات سرانجام دے سکتا ہے لیکن اگر کمیشن کی ریسرچ کے خطوط وہی ہیں جن کی طرف صدرِ محترم نے اپنے خطاب میں اشارہ کیا ہے' تو ہم عرض کریں گے کہ ایسا کمیشن قائم نہ کیا جائے۔ اس سے ان الجھنوں میں مزید اضافہ ہو جائے گا جن میں یہ بدقسمت ملک پہلے سے گرفتار ہے۔

———(۰)———

(۲)

ہمارے نزدیک' پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ اندوہناک' جگر پاش اور دلگداز سانحہ' ہمارے ان جیالوں سے متعلق ہے جو بھارت جیسے کمینہ دشمن کے چنگل میں گرفتار ہیں۔ وہ ہندو کے پنجۂ استبداد میں جس قسم کی صعوبت انگیز اور ذلت آمیز زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کے تصور سے جگر شق ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ہندو مکار کی سیکیاولی سیاست کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی لیکن اب بیرونی دباؤ سے ذرا سی امید کی جھلک نظر آ رہی ہے کہ شاید تاریکیوں کے یہ دن ختم ہو جائیں۔

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں، مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں!

خدا کرے کہ یہ سحر جلد طلوع ہو جائے اور ہمارے یہ جگر کے ٹکڑے بخیر و عافیت واپس آ جائیں۔ ایسا زود ہو یا بدیر'

ایک بات ابھی سے سمجھ لینی چاہیئے اور وہ یہ کہ جب یہ مجاہد واپس آئیں تو ان کی ایسی عزت افزائی کی جائے جس سے ان کے زخم مندمل ہو جائیں۔ غزوۂ موتہ میں جب فوج کے سردار یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے تو حضرت خالد بن ولیدؓ باقیماندہ فوج کو انتہائی تدبر کے ساتھ دشمن کے گھیرے سے نکال کر بخیریت واپس لے آئے۔ عربوں کے ہاں جنگ میں شکست کھا کر واپس آنا، بڑا ذلت آمیز سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں نے ان مجاہدین پر آوازے کسنے شروع کر دیئے تو حضورؐ نبی اکرمؐ نے انہیں سختی سے ٹوکا اور کہا کہ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ آنا وجۂ ذلت ہوتا ہے، شکست کھا جانا نہیں۔ یہ گروہ دولابی ہے۔ آج انہیں شکست ہوئی ہے، کل کو یہ دگنے جذبے کے ساتھ میدانِ جنگ میں جائیں گے اور اپنی شکست کا بدلہ لیں گے۔ اسی طرح جب جسر کی جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو شکست خوردہ سپاہی واپس آکر مدینے میں شرم سے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی اور کہا کہ میدانِ جنگ میں کسی وقت شکست کھا جانا، کوئی ندامت کی بات نہیں۔ تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹) میدانِ کارزار میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے اس حوصلہ افزائی سے ان کے دل اتنے بڑھے کہ جب وہ دوبارہ جنگ کے لئے نکلے ہیں تو انہوں نے پورے ایران کو فتح کئے بغیر اپنے قدم نہیں روکے۔

اور ہمارے یہ نوجوان بھگوڑے تو ایک طرف شکست خوردہ بھی نہیں۔ یہ ایک غدار کی ملت فروش سازش کا شکار ہو گئے تھے۔ یہ جس جذبہ کے ماتحت وہاں لڑے تھے وہ انتہائی قابلِ قدر ہے اور ہر قسم کی عزت و تکریم کا مستحق ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جب یہ سینہ چاکانِ چمن مراجعت فرمائے وطن ہوں تو ان کا فاتحانہ استقبال کیا جائے اور یہ جس سمت سے گذریں، تہنیت و تبریک کے نعرے ان کے لئے فردوسِ گوش بنیں۔

یاد رکھئے! ہماری فوج، دنیا کی بہترین افواج میں سے ہے اور اس کے کارنامے قوم کے لئے باعثِ صد سرفرازی اور مستحق ہزار شکر گذاری ہیں۔ سرفروشوں کے احسانات کا بدلہ کون اتار سکتا ہے۔ انہیں اذنِ بال کشائی دیجئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح دہلی کے لال قلعہ پر ہلالی پرچم نصب کر کے نہیں آتے! ہمارا شروع سے نصب العین ہی یہ ہونا چاہیئے تھا۔ (اس کے متعلق ہم تفصیل سے پھر کبھی لکھیں گے۔)

~~~~~~~~~(۰)~~~~~~~~~

(۲)

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ آپ سانس کیسے لیتے ہیں! اس پر غور کرنا تو ایک طرف اس کی طرف کبھی آپ کا خیال تک بھی نہیں گیا ہوگا۔ عملِ تنفس آپ کی خواہش، ارادے یا کوشش کے بغیر از خود جاری و ساری رہتا ہے حتیٰ کہ یہ نیند کے عالم میں اور بیہوشی کی حالت میں بھی جاری رہتا ہے اور آپ کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن آپ نے ضیق النفس (دمہ) کے مریض کو دیکھا ہوگا کہ یہی سانس اسے کس طرح مجسمہ درد و کرب بنا دیتا ہے۔ وہ ایک پورے سانس کے لئے تڑپتا، پھڑکتا اور ہر ایک کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اور جب اسے بھرپور سانس نصیب ہو جاتا ہے تو وہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔

قوموں کی زندگی میں مملکت کا آئین عملِ تنفس کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ قومی زندگی معمول کے مطابق ہو تو آئین کے متعلق کسی کو خیال تک بھی نہیں گذرتا، کہ یہ بھی کوئی پریشان کن مسئلہ ہے۔ لیکن جب قوم ضیق النفس کے مرض میں
~~~~~~~~~

مبتلا ہو جائے تو یہی آئین ان کے لئے کشمکش پیہم کا باعث اور موت و حیات کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ ہماری قوم اسی ضیق النفس کے مرض میں مبتلا چلی آ رہی ہے۔ اس اعتبار سے دس اپریل کا دن (جب آئین منظور ہوا) اس کی زندگی کا وہ لمحہ ہے جس میں اسے عمل تنفس کی برسوں کی جانگسل کشمکش کے بعد بھرپور سانس نصیب ہوا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انسانی زندگی میں کھوئے ہوئے سکون اور گم گشتہ اطمینان کی بازیابی کے ایسے ہی لمحات ہیں جنہیں انگریزی زبان میں (SIGH-OF RELIEF) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ خدا کرے کہ ہمارا یہ عمل تنفس اب مستقلاً قائم رہے کہ پچھلے سال کے ہچکولوں نے جسد ملت کا "انجر پنجر" توڑ کر رکھ دیا ہے۔

ان سطور کی تحریر تک آئین چھپ کر سامنے نہیں آیا۔ نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کب تک شائع ہو سکیگا لیکن اتنا واضح ہے کہ اس پرچہ کے پریس میں بھیجنے تک وہ ہمارے سامنے نہیں آ سکے گا۔ اس لئے اس میں ہمارا تبصرہ شائع نہیں ہو سکے گا۔ ویسے بھی ایسی اہم دستاویز پر تنقید و تبصرہ افراتفری میں نہیں ہونا چاہیئے۔ بایں ہمہ ایک اصولی حقیقت ایسی ہے جسے ہم اسی وقت سامنے لے آنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ آئین میں کتنے ہی اسقام کیوں نہ ہوں، وہ "بے آئینی" سے بہر نوع بہتر ہوگا۔ اسقام و اغلاط کی اصلاح ہو سکتی ہے لیکن بے آئینی سے پیدا شدہ انتشار و خلفشار کا کوئی مداوا ہی نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس آئین کو روبہ عمل آنے کا موقعہ دیا جائے اور اس کے اسقام و نقائص کو نہایت پُرسکون طریقہ سے آئینی طور پر دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ صاحب اقتدار پارٹی کو اس قدر اکثریت حاصل ہے کہ ان کی رضامندی کے بغیر کسی تجویز کو آئینی طور پر کامیاب کرایا ہی نہیں جا سکتا۔ لہٰذا آئینی طور پر اصلاح کی کوئی صورت ہی نہیں ـــ بجا اور درست۔ لیکن ہم ان حضرات سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ صورت حالات پیدا کس کی ہوئی ہے؟ خود آپ کی! آپ نے جمہوریت جمہوریت کا جو شور مچایا تو پھر جمہوریت کے نتائج کو آرام اور سکون سے بھگتئے۔ جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام فیصلے اکثریت کی رُو سے ہوں گے اور اقلیت کے لئے ان فیصلوں کی پابندی لازمی ہوگی۔ جب آپ نے جمہوریت کو آوازیں دے دیکر بلایا ہے تو پھر اس کے اس فطری نتیجہ پر چیختے کیوں ہیں؟

لیکن جس طرح ان حضرات کے اسلام کا تصور نرالا ہے اسی طرح ان کی جمہوریت کا تخیل بھی انوکھا ہے۔ ان کے نزدیک جو بات ان کی مرضی کے مطابق ہو وہ اسلامی ہے جو اس کے خلاف ہو وہ غیر اسلامی۔ اسی طرح جو کچھ ان کی منشاء کے مطابق ہو وہ جمہوری ہے ـــ خواہ یہ اقلیت ہی میں کیوں نہ ہوں۔ اور جو کچھ اس کے خلاف وہ غیر جمہوری، اور اس قابل کہ اسے توڑ پھوڑ دیا جائے؛ اس ذہنیت کے مطابق تو جمہوری نظام چل ہی نہیں سکتا۔

دوسری طرف ہم اکثریتی پارٹی کی خدمت میں بھی گزارش کریں گے کہ یہ صحیح ہے کہ جمہوری نظام کی رُو سے آپ کو حق حاصل ہے کہ اپنے فیصلوں کو قانون کی حیثیت دے دیں لیکن اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ قانونی طور پر صحیح ہو وہ فی الواقعہ بھی صحیح ہو۔ آپ کے لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھیں کہ ایسا کرنا فی الواقعہ درست ہے۔ یاد رکھیئے! قوم انہی اقدامات سے مطمئن ہو سکتی ہے جو فی الواقعہ درست ہوں، نہ ان سے جو صرف قانوناً درست ہوں۔ "قرآنی جمہوریت" میں وہ معیار پہلے سے موجود ہوتا ہے (اور وہ اکثریت یا اقلیت کا وضع کردہ نہیں ہوتا۔ خدا کا متعین کردہ ہوتا ہے) جس کی رُو سے یہ پرکھا جا سکتا ہے کہ فلاں اقدام "فی الواقعہ صحیح" ہے یا

نہیں۔ اس لئے اس نظام میں "قانوناً درست" اور فی الواقعہ درست" میں نہ تخالف ہوتا ہے نہ تصادم۔ لیکن جب وہ جمہوریت یہاں بار ہی نہیں پا رہی، تو بحالاتِ موجودہ اس کے سوا چارہ نہیں کہ اکثریتی پارٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے جمہوری اختیارات کے استعمال کے وقت، اس امر کا اطمینان بھی کر لیا کریں کہ ان کی تجویز یا اقدام میں فی الواقعہ کوئی سقم تو نہیں۔ اس سے قوم بھی مطمئن رہے گی، آئین کو بھی پائیداری نصیب ہو جائے گی اور مملکت کو بھی استحکام میسر آ جائے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ حکومت کے اقدامات پر جو تنقید بھی ہو اسے ٹھنڈے دل و دماغ سے سنا جائے اور تحمل و بردباری سے برداشت کیا جائے۔ اس سے وہ ذہنی کیفیت پیدا ہو سکے گی جس سے انسان مسئلہ زیر نظر پر پرسکون طریق سے غور و فکر کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دنیا میں کوئی انسان بھی مکمل (PERFECT) نہیں ہوتا اور جب ایک فرد مکمل نہیں ہوتا تو ایسے افراد کی اکثریت کس طرح مکمل اور منزہ عن الخطا ہو سکتی ہے؟ مغربی جمہوریت کا بنیادی نقص یہ ہے کہ وہ افراد میں تو غلطی کا امکان تسلیم کرتی ہے (TO ERR IS HUMAN) انہی کے ہاں کا مقولہ ہے۔ لیکن انہی افراد کے مجموعہ کو ہر قسم کے سہو و خطا سے مبرّی قرار دے دیتی ہے اور اس پر اصرار کرتی ہے کہ انہیں ایسا سمجھا جائے۔ قرآن کریم نے اس ذہنیت کو چودہ سو سال پہلے غلط قرار دیا تھا۔ اب انسانی تجربہ بھی اس کی تصدیق کر رہا ہے۔ جمہوری نظام کی سب سے بڑی علمبردار اقوام متحدہ (U.N.) ہے۔ اس تنظیم کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ۱۹۴۹ء میں ایک تحقیقاتی کمیٹی بدیں غرض مقرر کی تھی کہ وہ نظام جمہوریت کی سائنٹیفک طریق سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے ایک جامع سوالنامہ مرتب کر کے دنیا بھر کے مفکرین اور سیاسیین کے پاس بھیجا تھا۔ اس میں ایک سوال یہ تھا کہ "کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے؟" اس کے جواب میں کہا گیا تھا کہ

> یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔

اقلیت اگر یہ سمجھے کہ جمہوری نظام میں، اکثریت کو فیصلے کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور اس کے فیصلوں کو صرف آئینی طور پر بدلوایا جا سکتا ہے اور اکثریت اسے تسلیم کرے کہ اس کے فیصلوں میں غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں، تو ملک بہت سی مصیبتوں سے بچ جائے۔ خدا کرے کہ یہ بات اربابِ قوم کی سمجھ میں آ جائے۔

ایک ضروری اعلان

جس پریس میں آجکل طلوع اسلام چھپتا ہے اس میں کچھ تبدیلیاں متوقع ہیں۔ بنابریں ہو سکتا ہے کہ جون کے پرچہ کے چھپنے میں کچھ تاخیر ہو جائے۔ اگر آپ تک پرچہ جون تک بھی نہ پہنچے تو پھر سمجھ لیجئے گا کہ یکم جولائی کو دو ماہ کا پرچہ یک جا شائع ہوگا۔

(ناظم ادارہ)

تفہیم القرآن جلد پنجم پر تبصرہ ــــ طلوع اسلام کی آئندہ اشاعت میں شائع ہوگا (ناظم)

بجلیاں جس سے ہوئے بادل ہیں بھی پوشیدہ ہیں

ایک قرآنی گھرانے کے مجاہد کا قید بھارت سے اپنے والد ماجد محترم سید حسن عباس رضوی) اور والدہ محترمہ کے نام مکتوب ۔ خوش بخت ہیں وہ والدین جنہیں اللہ نے ایسا اولوالعزم سعادت اطوار فرزند عطا فرمایا ہے ۔ اور خوش نصیب ہے وہ قوم جس کے محافظ ایسے صاحب کردار نوجوان ہیں ۔

آپ لوگ بالکل فکر نہ کریں حالات ٹھیک ہو جائیں گے تاریخ میں دشمن کے لئے پہلی دفعہ ایسا موقع آیا ہے کہ وہ ہماری موجودگی سے فائدہ اٹھا سکے دیکھتے ہیں کہ وہ کتنا کامیاب ہوتا ہے یہ سب آپ لوگوں کے حوصلہ پر منحصر ہے جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارے لئے پاکستان کی قدر اور بڑھ گئی ہے اگر دشمن چاہے تو ہمیں ساری عمر قید رکھ لے کوئی پرواہ نہیں کیونکہ انکو بھی معلوم ہے کہ ہم نے اپنا حساب چکانا ہے اور اسکے لئے ہی ہمیں یہیں چھوڑ رہا ہے تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ضرور ہوگا باقی آپ پاکستان کیلئے دعا کیا کریں ۔ یہی ہماری فولادی ہمت ہیں باقی سب بہن بھائیوں کو پیار

نوازش علی

رابطۂ باہمی

یوں تو ملک کے گوشے گوشے میں قرآن کریم کے پیغام کو عام کرنے کے لئے بزموں کے احباب سرگرم عمل ہیں اور ان کی سعی وکاوش سے موجودہ ذہنی خلفشار بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ لیکن اس فکری جدوجہد میں بزم طلوع اسلام لاہور کے احباب، اراکین اور اس کے پرعزم اور جواں ہمت ناظمہ محترم پروفیسر خالد اسلام صاحب کی بے لوث تگ وتاز تحریک کے لئے باعث تقویت اور مستحق مبارکباد ہے۔ اس ماہ میں انہوں نے کئی اجتماعات کا اہتمام کیا۔ ۲۵ مارچ صبح ۹ بجے ۲۵/بی، گلبرگ ۲ میں محترم پرویز صاحب کے خصوصی درس کا عنوان تھا "قائد اعظمؒ نے پاکستان کیوں مانگا تھا"۔ بزم کے احباب نے اس اجتماع کے انعقاد سے نئی نسل کو پاکستان کی فکری وجہ جواز سے روشناس کرانے کی تاریخی ذمہ داری کو پورا کیا۔ یہ خطاب نہایت مؤثر اور خیال افروز تھا۔ اس کے بعد مؤرخہ ۱۵ اپریل کو "عید میلاد النبیؐ" کے موقع پر بھی خصوصی درس قرآن کا انتظام کیا گیا، محترم پرویز صاحب کے خطاب کا عنوان تھا "مساوات محمدیؐ"۔ ان دنوں ملک میں یہ اصطلاح بحث وتمحیص کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اسی لئے لاہور کے ارباب فکر ونظر کی کثیر تعداد نے اس اجتماع میں شمولیت کر کے اسے کامیاب بنایا۔ اسی شب ایک محفل شعر ونغمہ کا بھی انتظام کیا گیا۔ جس میں محترم نذیر فاروقی صاحب نے رات گئے تک کلام اقبالؒ کو نہایت دلآویز اور دلکش انداز سے پیش کیا۔

وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور، جہاں اکثر اہم اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ ۲۱ اپریل کو یوم اقبالؒ منانے کے لئے بھی احباب بزم نے انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔ اور توقع ہے کہ یہ جلسہ جس میں پرویز صاحب کے خطاب کا عنوان ― "اقبالؒ اور دو قومی نظریہ" ہوگا حسب معمول کامیاب ہوگا۔ (یہ سطور اس اجتماع کے انعقاد سے پہلے سپرد قلم کی جارہی ہیں)

لاہور سے باہر بھی بزم لائل پور ۲۴ اپریل کو اور بزم گجرات/جلالپور جٹاں ۲۷ اپریل کو کھلے اجلاس منعقد کر رہی ہیں جس میں مفکر قرآن کے خطاب ہوں گے۔

مزید برآں بزم لاہور نے واحد برادرز ۱۲۸۔ بادامی باغ (لاہور) میں ایک دارالمطالعہ بھی کھولا ہے جس کے اوقات فی الحال شام ۵ بجے سے ۷ بجے تک ہیں۔ اس کا فون نمبر ۵۸۹۳۳ ہے۔ اس کے قیام میں بزم لاہور کے دیرینہ رکن محترم چوہدری فتح محمد صاحب کی مساعی جمیلہ بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

ادارہ ان احباب بزم کی اس تگ وتاز اور مساعی جمیلہ پر مبارکباد دیتا ہے۔

بزم کراچی

یہ امر موجب سعادت وافتخار ہے کہ بزم کراچی نے بھی عید میلاد النبیؐ اور یوم اقبالؒ کی تقریبات علی الترتیب ۲۲ اپریل صبح ۹½ بجے اور ۲۷ اپریل بروز جمعہ ۷ بجے شام منانے کا اہتمام کیا ہے۔ اس موقع پر مفکر قرآن علامہ پرویز صاحب کے خصوصی خطابات بزم کے دفتر میں بذریعہ ٹیپ نشر کئے جائیں گے۔ ان مبارک ومسعود تقریبات کے اہتمام کے لئے ادارہ اراکین بزم کراچی اور ان کے جواں ہمت ناظمہ محترم احتشام صاحب کو سزاوار تہنیت قرار دیتا ہے۔

بقیہ: مجلسِ مذاکرہ ۔ ص ۵۶ سے مسلسل

سے ہمکلام ہونے کا خواہش مند ہے۔ خواہشوں کے ہیجان نے اندھا کر رکھا ہے۔ اور ان کا وجود سیاہ بادلوں میں بجلی کی مانند نہیں بلکہ بارش کے گرتے ہوئے موسلا دھار قطروں کی مانند ہیں ۔۔ ! پیاسی زمین ان سب کو جذب کر رہی ہے۔ اس طرح جذب و کیفیت میں سب سے بڑی مجذوب ہستی' زمین کی ہے۔ اقدار کی خاطر ان مجذوبوں کو بصیرت بخشنے والے شہیدوں کا خون' خام فکری کے بتوں کی زینت بنا دیا گیا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ شہید کا خون نہ صرف خود صادق و امین ہوتا ہے بلکہ اس کی ذات سراپا صداقت ہوتی ہے۔ اس طرح اس کا وجود پختہ فکر کا مکمل پیکر ہوتا ہے ۔۔ وہ خود فکر کا حسین ترین پرتَو ہوتا ہے ۔۔ !

لیکن دہشت سے متاثر ہونے والا ذہن' اور خوف میں پلنے والی ذہنیت' لالچ میں الجھی ہوئی سوچ' اس کو کیسے سمجھ سکے گی ۔۔ یہ ایک مسئلہ ہے' ایک مشکل ہے ۔۔ اقبالؒ نے سچ کہا تھا کہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

برقِ طور

کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کا تازہ ایڈیشن شائع کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون اور بنی اسرائیل کی داستانِ عروج و زوال کے واقعات کے علاوہ عصائے موسیٰؑ، یدِ بیضا، ساحرینِ دربارِ فرعون کی حقیقت، سمندر کا پھٹنا اور چشموں کا پھٹنا، من و سلویٰ کا عطا ہونا وغیرہ اہم مباحث پر بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ جلد مضبوط اور حسین گرد پوش سے مزین، عمدہ سفید کاغذ۔

قیمت فی جلد:- ۱۵/- روپے (علاوہ محصول ڈاک پیکنگ)

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/ بی گلبرگ لاہور

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دکان

سٹینڈرڈ آٹوموبائلز

پر تشریف لایئے

ڈیلرز :- موٹر پارٹس

ٹرک (ڈیزل) پارٹس

سپیشلسٹ :- ڈاج - بیڈ فورڈ - لی لینڈ

ٹی - ایل - ایم - سی

۱۳۰ - بادامی باغ - ٹیلیفون 69012 لاہور

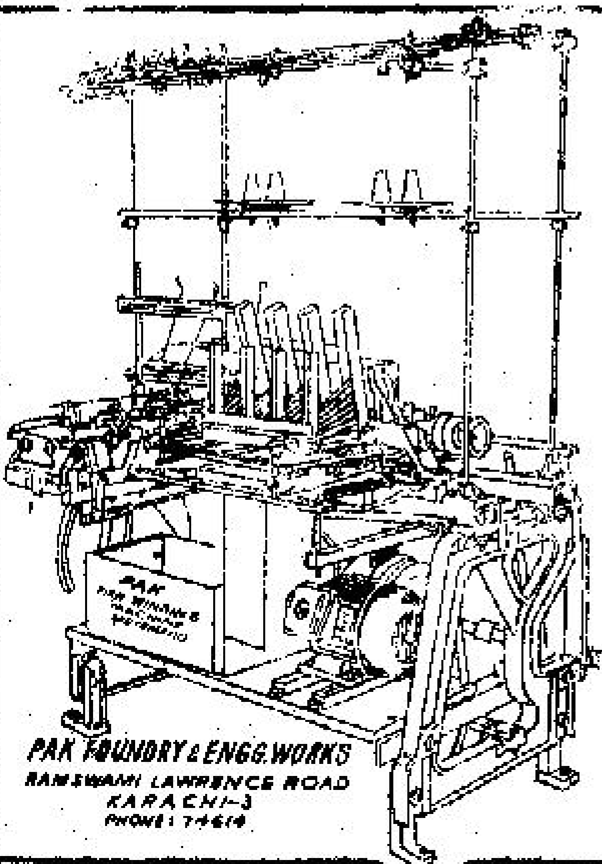

SOLE MANUFACTURERS

of

FOUR SPINDLE AUTOMATIC PIRN WINDING MACHINES

PAK FOUNDRY & ENGG. WORKS

RAMSWAMI

LAWRENCE ROAD

KARACHI-3 PHONE: 74614

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

باسمہٖ تعالیٰ

شرکتِ میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

اقبال اور دو قومی نظریہ

(پرویز)

یوم اقبال کی تقریب منعقدہ ۲۱ اپریل ۱۹۷۳ء پر

خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبالؒ اور دو قومی نظریہ

صدرِ گرامی قدر و عزیزانِ ملت! سلام و رحمت۔

کاروانِ انسانیت کی داستان بھی عجیب و غریب ہے۔ اس میں سے لاکھوں انسان روزانہ کہیں گم ہو جاتے ہیں اور لاکھوں نئے افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ افراد کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ پہلے دن سے جاری ہے اور آخری دن تک جاری رہے گا۔ ان آنے جانے والوں کی گمنامی کا یہ عالم ہے کہ ان کی داستانِ حیات تو ایک طرف زمانے کی ریگِ رواں پر ان کے نقوشِ قدم تک بھی نہیں ملتے۔ لیکن اسی گمنام ہجوم اور بے نام و نشان انبوہ میں کبھی کبھار ایسے افراد بھی آجاتے ہیں جو زندہ و پائندہ روشنی کے مینار وں کی طرح چمکتے اور کاروانِ انسانیت کے لئے نشانات راہ اور سراغِ منزل بنتے ہیں۔ تاریخِ انسانیت درحقیقت انہی قندیلوں کی تابندہ شعاعوں سے عبارت ہے۔ اسی قسم کے افراد تعمیرِ انسانیت کے معمار اور تحسینِ کائنات کے نقش گر ہوتے ہیں۔ یہی وہ سیرت سازِ اقوام و ملل ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ:

فطرت کے مقاصد کا عیار ان کے ارادے		دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

انہی زندہ جاوید ہستیوں میں اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کا شمار ہوتا ہے جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ وہ یگانۂ روزگار جس کے متعلق خود اس نے کہا تھا کہ:

عمرہا درکعبہ و بت خانہ می نالد حیات		تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

صدفِ زمانہ ہزاروں سال تغیّراتِ حوادث کی موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہے تب جا کر اس قسم کے گوہرِ یک دانہ کی نمود ہوتی ہے۔

نقیبِ قرآن

عزیزانِ من! مشرق نے علامہ اقبال کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانا۔ اسی لئے انہیں زیادہ سے زیادہ شاعرِ مشرق کے لقب سے نوازا گیا۔ مغرب نے انہیں ایک فلاسفر کی حیثیت سے پہچانا اور دنیا کے ممتاز مفکرین کی صف میں انہیں جگہ دی۔ اس میں شبہ نہیں کہ شعر و فکر کی دنیا میں بھی ان کا مقام بہت بلند ہے لیکن میرے نزدیک ان کا صحیح مقام کچھ اور ہے اور وہ مقام ہے پیامبرِ قرآن ہونے کا۔ پیغمبر نہیں پیغامبر یا نقیب۔ میرے دل میں حضرت علامہ کی جو عظمت و عقیدت ہے وہ ان کے اسی مقام کی بنا پر ہے۔ خدا کی یہ کتابِ عظیم جسے ... صدیوں سے مقدس غلافوں میں لپیٹ کر زینتِ طاق نسیاں ہو رہی تھی۔

اقبال نے اسے ان غلافوں سے نکالا اور اس کے پیغامِ حیات بخش کو اس انداز سے عام کیا کہ اس کے غلغلوں سے فضا گونج اٹھی۔ اس نے خوابیدہ ملتِ اسلامیہ کو جھنجھوڑا اور کہا کہ:-

منزل و مقصود قرآں دیگر است　　رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

اس نے کہا کہ کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ:-

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد　　در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ درد

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست　　خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

اس نے اس انقلاب آفریں ضابطۂ حیات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ:-

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

یعنی:-

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

ایک طرف قرآن نے ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا اور دوسری طرف اس نے مذہبی پیشوائیت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست　　نقشہائے کاہن و پاپا شکست

اس نے قرآن کے اس پیغام کو عام کیا کہ:-

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے　　پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

اس نے کہا کہ ان خود ساختہ "نمائندگانِ خداوندی" کی حالت یہ ہے کہ:-

حق را بسجودے، صنماں را بطوافے

یہ طواف بتوں کا کرتے ہیں اور خدا کو اپنے سجدوں سے دھوکا دیتے ہیں اس لئے

بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

قرآن انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے رہنمائی دیتا ہے اس لئے پیغامِ اقبال کے بھی متعدد پہلو ہیں۔ میرے لئے یہ مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ میں ایک نشست میں تمام گوشوں کا احاطہ کر سکوں۔ ایک نشست میں ان میں سے کسی ایک گوشے ہی کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ میں نے آج کی تقریب کے لئے ایک ایسے گوشے کا انتخاب کیا ہے جس نے پاکستان کی اجتماعی زندگی میں انتہائی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ اور جس پر میرے نزدیک اس مملکت کی موت و حیات کا انحصار ہے۔ جیسا موضوع ہے ——— دو قومی نظریہ ——— بظاہر ایسا نظر آئے گا کہ یہ مسئلہ ہنگامی سیاست سے متعلق ہے جس کا فیصلہ ہمیں اپنی سیاسی مصلحتوں کے مطابق کر لینا چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ آپ دیکھیں گے اس مسئلہ کا تعلق ہماری ہنگامی سیاست سے نہیں۔ یہ قرآن کی پیش کردہ ابدی حقیقت ہے اور دین کا اصل الاصول۔ علامہ اقبال نے اسے

اسی حیثیت سے پیش کیا اور اس کی بنیادوں پر اس مملکت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی عمارت کے استحکام کا انحصار اس کی بنیاد پر ہوتا ہے اسی طرح مملکتِ پاکستان کی سالمیت کا دار و مدار اسی نظریہ پر ہے اور اس کی یہی اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر میں نے اسے اپنے خطاب کا موضوع قرار دیا ہے۔

عزیزانِ من!! اگر کوئی یہ کہے کہ ایک فقرہ میں بتایئے کہ اسلام کا مقصود و منتہیٰ اور دین کی غایت الغایات کیا ہے تو اسے پورے حتم و یقین کے ساتھ متعین طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا مقصود اور اس کے عملی نظام (دین) کی غایت یہ ہے کہ نوعِ انسان کے اختلافات و افتراقات کو ختم کر کے اسے آسمانی اقدار کی بنیادوں پر ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے انسانوں نے جب اپنی تمدنی زندگی کا آغاز کیا ... تو قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ

دین کی غایت

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2/213) اس وقت تمام انسان ایک برادری (امتِ واحدہ) کی شکل میں رہتے تھے۔ ان میں نہ باہمی اختلاف تھا نہ افتراق۔ نہ تزاحم تھا نہ تصادم۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے۔ ان میں "میری اور تیری" کی کوئی تمیز نہ تھی اس لئے جس کو جہاں بھوک لگے وہیں سے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا۔" (2/35) اس طریقِ زندگی میں نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا تھا نہ پیاس کا۔ نہ کپڑے کی فکر دامن گیر پریشانی ہوتی تھی نہ مکان کی ؟ (20/118-119) ان سے کہا گیا تھا کہ تم اسی طرح ایک برادری بن کر رہنا۔ فَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (2/35) باہمی مشاجرت اختیار نہ کر لینا۔ مشاجرت کے معنی ہیں شجرہ کی طرح ہو جانا کہ جس کی اصل ایک ہونے کے باوجود شاخیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ لیکن انسانوں نے اس سے اعراض برتا۔ فَاخْتَلَفُوْا (10/19) اور آپس میں اختلاف پیدا کر لیا۔ یہ ابتدائی اختلاف کا نتیجہ ہے کہ وہ نسل کی بنیاد پر قبیلوں میں بٹ گئے اور بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (2/36) اس طرح ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں۔ جسے قرآن نے فساد کہہ کر پکارا ہے اور باہمی خونریزیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا (2/30) (5/32) ان اختلافات کا مٹانا، اور فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کے بنیادی سبب کا ختم کرنا انسانوں کے اپنے بس کی بات نہ تھی۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ انسان اپنے معاشرہ کو اقدارِ خداوندی کے مطابق متشکل کرے۔ اسی لئے کہا کہ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۔ اس مقصد کے لئے خدا نے انبیاء کرام کو بھیجنا شروع کیا جو لوگوں کو متنبہ کرتے تھے کہ اگر تم اسی طرح خاندانوں اور قبیلوں، اور فرقوں میں بٹے رہے تو تباہ ہو جاؤ گے اور اگر تم اقدارِ خداوندی کے مطابق امتِ واحدہ بن گئے تو اس کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں ہوگا۔ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (2/213) ---- اس مقصد کے لئے ان انبیاء میں سے ہر ایک کو الکتاب[1] (ضابطہ ہدایات و قوانین) بھی دیا تاکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے انہیں ایک امت کے قالب میں ڈھال دیں۔

---

[1] جو لوگ کہتے ہیں کہ نبی بغیر کتاب کے بھی آ سکتا ہے وہ قرآن کریم کی اس واضح آیت کی تکذیب کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ تمام انبیاء کو کتابیں دی گئی تھیں۔

یہ تھا عزیزانِ من! انبیاء کے بھیجنے اور ان کے ساتھ کتابیں نازل کرنے کا مقصد۔ یعنی ان اختلافات کو مٹا کر جن کی وجہ سے نوعِ انسان، مختلف خاندانوں، قبیلوں اور قوموں میں بٹ گئی تھی اور اس لئے باہمی خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کا حشر بپا ہو رہا تھا اسے امتِ واحدہ (ایک عالمگیر برادری) بنا دیا جائے۔ جو لوگ انبیاء کرامؑ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنے نسلی قبائلی اور قومی امتیازات کو مٹا کر وحی کی رہنمائی کے مطابق امتِ واحدہ کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جاتے وہ ایک مرکز پر جمع ہو جاتے۔ جو اس دعوت کی مخالفت کر کے اپنے امتیازات کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف قبائل اور اقوام کی گروہ بندیوں کو قائم رکھنا چاہتے، وہ ان کے برعکس دوسرا گروہ بن جاتے۔ اول الذکر کو امتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کہا جاتا۔ یعنی امتِ واحدہ کے نظریہ کو تسلیم کرنے اور اس کی صداقت پر ایمان لانے والے۔ اور دوسری جماعت کو کفار کہا جاتا۔ یعنی اس نظریۂ زندگی سے انکار کر کے نسلی اور قومی امتیازات کو برقرار رکھنے پر اصرار کرنے والے۔ اس طرح پوری نوعِ انسانی دو گروہوں میں بٹ جاتی۔

اے برادرانِ عزیز!! دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ نظریہ نہ تو تحریکِ پاکستان کے دوران وضع کیا گیا تھا اور نہ ہی اسے حصولِ مملکتِ پاکستان کے لئے سیاسی حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ یہ اسلام کی غایت اور دین کا اساسی اصول تھا جو اس دن وجود میں آ گیا تھا جب خدا کی طرف سے سلسلۂ وحی کا آغاز ہوا تھا۔ قرآن کریم میں اس سلسلۂ زریں کی داستان کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے۔ انہوں نے اس دعوت کو پیش کیا تو ان کی قوم کے کچھ افراد اس پر لبیک کہہ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور باقی قوم نے اس نظریہ کی مخالفت کی اس طرح ایک قوم کے بجائے دو قومیں وجود میں آ گئیں۔ ان دونوں قوموں کی نسل ایک تھی زبان ایک تھی، قبیلہ ایک تھا، وطن ایک تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک قوم نہیں رہی تھی دو قومیں بن گئیں تھیں۔ ان کے دو قومیں بن جانے کی بنیاد کیا تھی؟ بس ایک نظریہ کا اختلاف۔ اسے کہا جاتا ہے دین یا ایمان کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل۔ ان دو گروہوں میں یہ خلیج اتنی گہری اور ناقابلِ عبور تھی کہ جب حضرت نوحؑ نے نسلی رشتہ کی بنیاد پر کہا کہ ان کا بیٹا ان کے اہل میں سے ہے تو خدا نے یہ کہہ کر ان کا مغالطہ دور کر دیا کہ ۔ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (11/46) وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ اس نظریہ پر ایمان نہیں لایا جسے تم نے پیش کیا ہے۔ یعنی نظریہ کے اختلاف سے، وطنی اور قبائلی تعلق تو ایک طرف، خاندانی اور نسلی رشتہ بھی باقی نہیں رہتا۔ باپ اور بیٹے کا رشتہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے حضرت نوحؑ کے بعد مختلف اقوام اور ان کی طرف بھیجے گئے انبیاء کرامؑ کا ذکر کیا ہے اور وضاحت سے بتایا ہے کہ انہوں نے اس دو قومی نظریہ پر کس طرح عمل کیا اور اس کے نتیجہ میں ایک ہی وطن میں، نسل، قبیلہ، زبان، رنگ اور خون کے اشتراک کے باوجود نظریہ کے اختلاف کی بنیاد پر دو قومیں وجود میں آتی رہیں۔ ان کا پیش کردہ معیار جس سے اپنے اور بیگانے کی تخصیص ہوتی تھی یہ تھا کہ:-

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۔ (14/36)

جو میرے مسلک کا اتباع کرتا ہے وہ میرا ہے (جو اس کے خلاف چلتا ہے میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں)

یہ سلسلۂ رشد و ہدایت اسی طرح جاری رہا۔ تا آنکہ آج سے چودہ سو سال پہلے، سرزمینِ عرب میں اس نبی آخر الزماںؐ کا ظہور ہوا۔ جس پر دین کی تکمیل ہو گئی اور سلسلۂ نبوت کا اختتام۔ خدا کے اس آخری رسولؐ نے دو قومی نظریہ پر اس طرح عمل کر کے

حضور خاتم النبیینؐ کے دور میں

دکھایا کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں نہ کسی قسم کا شک و شبہ رہا نہ کوئی ابہام و التباس۔ اس نظریہ کی دو شقیں تھیں۔ ایک یہ کہ ایک ہی ملک میں بسنے والے

ایک ہی زبان بولنے والے، ایک ہی نسل سے متعلق افراد اگر اس نظریہ کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے تو وہ اُس قوم کے افراد نہیں بن سکتے۔ جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتی ہے۔ بالفاظ دیگر، مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ خواہ وہ ایک ہی وطن کے باشندے اور ایک ہی نسل کے افراد کیوں نہ ہوں۔ اور دوسری شق یہ تھی کہ ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر جو قوم (امت) متشکل ہوگی اس میں زبان، رنگ، نسل، وطن کی کوئی تخصیص باقی نہیں رہے گی۔ وہ سب ایک قوم کے افراد اور ایک تسبیح کے دانے ہوں گے۔ شق اول کا عملی مظاہرہ اس طرح ہوا کہ رنگ، نسل، وطن کا اشتراک تو ایک طرف حضورؐ کا حقیقی چچا ابولہب جس نے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا تھا اس قوم کا فرد تسلیم نہیں کیا گیا جو ایمان کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آئی تھی اور حضورؐ کے دوسرے چچا عباسؓ اور داماد ابوالعاصؓ بھی اس وقت تک اس جدید قوم میں شمار نہیں کئے گئے جب تک وہ ایمان نہیں لے آئے۔ جہاں تک دوسری شق کا تعلق تھا حبش کا بلالؓ اور روم کا صہیبؓ، فارس کا سلمانؓ اور عرب کا ابوبکرؓ (رضی اللہ عنہم اجمعین) وطن، زبان، رنگ، نسل کے اختلافات کے باوجود ایک امت کے افراد قرار پا گئے۔ ان میں ایسی وحدت اور یگانگت پیدا ہوگئی کہ اس کے بعد وطن، زبان، رنگ، نسل کی سابقہ نسبتوں کا تصور تک بھی ان کے ذہن میں نہ آیا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ خدا کی توحید پر ایمان کا عملی مفہوم امت کی وحدت ہے اور اس وحدت میں کسی قسم کی تفریق شرک ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ:-

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ. مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا (۳۰/۳۱)

مسلمانوں دیکھنا! کہیں توحید پرست ہونے کے بعد پھر سے مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور قوم مختلف گروہوں میں بٹ گئی" تو اس تفرقہ سے مراد صرف مذہبی فرقہ پرستی نہیں۔ اس سے مراد ہے ہر قسم کی تفریق خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں، وہ ذاتوں اور برادریوں کے رنگ میں ہو اور خواہ جداگانہ قومیتوں کے پیکر میں۔ یہ تمام اختلافات شرک ہیں اور چونکہ امت کی تشکیل رسول کی نسبت سے ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور اس طرح امتِ واحدہ رہنے کی بجائے مختلف گروہوں میں بٹ جائیں اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس باب میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کسی جنگ میں دو (مسلمان) سپاہیوں میں کسی بات پر باہمی جھگڑا ہو گیا تو ان میں سے ایک نے سابقہ عادت کی بنا پر، غیر شعوری طور پر اپنے قبیلہ کو مدد کے لئے پکارا اور دوسرے نے اپنے قبیلے کو۔ حضورؐ کے گوشِ مبارک تک یہ آواز پہنچی تو آپ فوراً خیمہ سے باہر تشریف لائے اور سخت برافروختگی کے عالم میں فرمایا "تم لوگ ایمان لانے کے بعد پھر عہد جاہلیہ کی طرف پلٹ رہے ہو۔ یاد رکھو! یہ اسلام نہیں"۔ اسلام تو وہ تھا جس کا اعلان حضورؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں جو عالمگیر انسانیت کا منشور عظمیٰ ہے ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ:-

> عہد جاہلیہ کے تمام باطل نظریات میرے پاؤں تلے ہیں۔ یاد رکھو تم سب ایک امت ہو۔ تمہارا رب ایک ہے۔ اصل کے اعتبار سے تم سب ایک ہو۔ اس لئے کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کسی قسم کی کوئی فضیلت نہیں بجز تقویٰ کے۔"

یوں دین کی تکمیل ہو گئی۔ حضورؐ کے بعد کچھ عرصہ تک امت، امتِ واحدہ رہی۔ اس میں کسی قسم کا کوئی تفرقہ پیدا نہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد یہ

حضورؐ کے بعد

گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور سب سے پہلے اسی قبائلی تفریق نے سر نکالا جسے حضورؐ نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ پہلے مملکت خلافتِ راشدہ تھی۔ اس کے بعد یہ بنو امیہ، بنی عباس، بنو فاطمہ کی قرار پا گئی۔ جب سلطنت اور حکومت کی نسبت قبائل کی طرف ہوئی تو مسلمان بھی امتِ واحدہ نہ رہے۔ مذہب کی دنیا میں یہ جس طرح فرقوں میں بٹی اس سے قطع نظر، قومی اعتبار سے ترکوں، مغلوں، عربوں، افغانوں، ایرانیوں میں بٹ گئی۔ پھر ان میں ذاتوں اور برادریوں کی تفریق در آئی۔ اب مسلمان اسلام کی طرف نسبت سے امتِ مسلمہ بننے کے بجائے سید، پٹھان، قریشی، راجپوت، جاٹ، اعوان، ارائیں کی نسبتوں سے الگ الگ برادریوں میں تقسیم ہو گئے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

اس طرح صدرِ اوّل کے بعد یہ امت، امتِ واحدہ نہ رہی۔ مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹ گئی۔ یہ چیز یقیناً موجبِ صد انتشار و تشتت تھی۔ لیکن اس کے باوجود ایک بات باعثِ اطمینان بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ اس دوران میں دو قومی نظریہ کی دوسری شق بہرحال قائم رہی۔ یعنی مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم کبھی نہ بنے۔ یہ کسر مغرب کے نظریہ قومیت نے پوری کر دی۔

نیشنلزم کی لعنت

اس نظریہ کی رو سے ایک ملک میں بسنے والے تمام افراد بلا لحاظ مذہب و ملت ایک قوم کے افراد قرار پا گئے۔ اس نظریہ کو نیشنلزم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مغلوں کی حکومت کے زمانے تک اس نظریہ نے ہندوستان میں بار نہیں پایا تھا۔ اس وقت تک مسلمان، غیر مسلموں سے الگ، ایک متعین اور منفرد قوم کے افراد تھے۔ انگریزوں نے اس نظریہ کو یہاں بھی عام کیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس کا چرچا ہر جگہ ہونے لگا۔ یہیں سے ہمارے سامنے وہ اقبال آتا ہے جس کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔

اقبالؒ کی پیدائش، تعلیم و تربیت اسی (غیر منقسم) ہندوستان میں ہوئی تھی جہاں کی فضا نیشنلزم کے پراپیگنڈے سے معمور تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہونہار طالب علم کا اس فضا سے متاثر ہو جانا فطری امر تھا۔

اقبال کا ذہنی انقلاب

وہ انہی خیالات کو اپنے ذہن میں لئے مزید تعلیم کے حصول کے لئے ۱۹۰۵ء میں یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ دانایانِ مغرب اس نظام کو نوعِ انسان کی مشکلات کا مداوا قرار دے رہے تھے۔ چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک و تہنیت کے تحائف پیش کئے جا رہے تھے۔ ان حالات میں ایک ایسے نوجوان طالب علم کو جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو متشدد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن مورخ کی نگاہ یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ گیا تھا تو یہ گنگناتا ہوا کہ

—— خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے —— اور واپس آیا تو یہ الاپتا ہوا کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ گیا تھا تو یہ سندیش دیتا ہوا کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ

بنایا ہمارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے نرالا بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اقبالؒ کے قلب و دماغ میں اس قسم کا انقلاب کس طرح آیا تھا، اس کی وضاحت انہوں نے ۱۹۳۸ء میں (مولانا حسین احمد مدنی مرحوم) کے ساتھ نظریہ وطنیت کے موضوع پر بحث و تمحیص کے سلسلہ میں کی تھی۔ (اس معرکہ کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آتی ہے) انہوں نے کہا تھا کہ وطن سے محبت اور اس کی خیرسگالی کا جذبہ ایک فطری امر ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن

زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں "وطن" کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں، بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے "وطن" کو جب ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔ (اور یہ وجہ ہے کہ میں اس نظریہ قومیت کی مخالفت کرتا ہوں)

چونکہ وطنیت یا قومیت کا یہ نظریہ اسلام کے نظریہ قومیت کے خلاف تھا اس لئے اقبالؒ نے اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دیا کہ اس کے خلاف شدید جہاد کیا جائے۔ بانگِ درا میں وطنیت کے عنوان سے جو نظم زیبِ داستان ہے اور

اقبالؒ کا جہاد

جسے اقبالؒ نے یورپ سے واپسی کے بعد لکھا تھا، اس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا ہے کہ یہ نظریہ کس طرح اسلام کا نقیض، اور نوعِ انسان کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔ اس نظم کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے تمام تر آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اِس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اِس سے

اقبالؒ مسلسل اپنی اس پکار کو دہراتا رہا، اور قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کو (بالخصوص) اس نظریۂ قومیت کی تباہ کاریوں اور فتنہ سامانیوں سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ کبھی وہ ان سے ''رمز وایماء'' کے انداز سے کہتا کہ

بادطن وابستہ تقدیرِ اُمم — بر نسب بنیادِ تعمیرِ اُمم

لیکن ــــ

ملتِ ما را اساسِ دیگر است — ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

اور کبھی اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کرتا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِؐ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

(۰)

اقبالؒ کا یہ پیغام ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں تھا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، اسلام کا اصولِ قومیت یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ وہ کسی خطۂ زمین میں بستے ہوں، ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ بعض ایک قوم کے افراد نہیں، ایک دوسرے کے بھائی ــــ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ ۔ (۴۹/۱۰) قرآن کا ارشاد ہے۔ اس اخوت کو اس نے کتاب اللہ سے وابستگی کا لازمی نتیجہ اور خدا کی خصوصی نعمت قرار دیا ہے جب کہا کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۔ (۳/۱۰۳) خدا نے تمہیں اپنی نعمت کی رو سے بھائی بھائی بنا دیا۔ اس اخوت کی بنا پر یہ امت کسی ایک خطۂ زمین میں محدود و محصور نہیں تھی۔ مسلمان جہاں بھی تھا، دنیا کے کسی خطے میں بھی سکونت پذیر تھا، دنیا کے باقی مسلمانوں کا بھائی اور امتِ مسلمہ کا فرد تھا۔ تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے اجزاء تھے۔ بنا بریں جس طرح نسلی وابستگی کی بنا پر مسلمانوں کی الگ الگ قومیت کا تصور خلافِ اسلام ہے اسی طرح جغرافیائی حدود (یعنی وطن کی نسبت) کی بنا پر ان کی جداگانہ قومیتوں کا نظریہ بھی دین کی تنقیض ہے۔ اقبالؒ جو اسلام کی اس عالمگیر دعوت کا گہرا احساس رکھتا تھا، اپنے اس پیغام کو ہندوستان کی چار دیواری سے آگے لے جا کر،

عالمگیر امت

پورے عالمِ اسلام تک پھیلا دیا۔ اس نے ۱۹۲۲ء میں جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور ترکی کی بالخصوص حالت بڑی سقیم ہو رہی تھی، جملہ عالمِ اسلام کو مخاطب کر کے کہا کہ یاد رکھو، بیماری نکبت و زبوں حالی کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا　　ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی　　اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر!

اور اس سے اگلے سال (۱۹۲۳ء میں) انہوں نے اپنی مشہور نظم طلوعِ اسلام میں اپنی اقوام کو مخاطب کر کے کہا کہ

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو　　اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی　　تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اس سلسلہ میں میں عزیزانِ من! آپ کی توجہ ایک عظیم حقیقت کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ ہم میں سے کون ہے جسے اس کا علم و احساس بلکہ شکایت نہیں کہ دوسرے ملکوں کی مسلمان سلطنتوں نے ہم ہند و پاک کے مسلمانوں کے مصائب و آلام میں بالعموم اس ہمدردی اور یگانگت کا ثبوت کبھی نہیں دیا جس کی ان سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہماری کیفیت

ہمارا احساسِ اخوت

یہ ہے کہ اگر افریقہ میں کسی حبشی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو ہماری آنکھ سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اس حکیم الامت نے اسلام کی عالمگیر اخوت کا وہ پیغام دیا ہے جو نسل، رنگ، وطن کی حدود و ثغور سے ماوراء ہے اور جو ہماری ملت کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ اس لئے مسلمانانِ عالم پر کہیں مصیبت آئے غیر شعوری طور پر ہمارے قلوب وقفِ اضطراب اور ہماری آنکھیں خونابہ فشاں ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۱۲ء سے جنگِ طرابلس میں ایک عرب لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہو گئی تو اس کی یاد میں اقبالؒ نے جو نظم خونچکاں لکھی اس کے سننے سے آج بھی حساس قلوب سینوں میں تڑپ اٹھتے ہیں۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے　　ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی　　غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی!

اس کے بعد اقبالؒ نے یہ نہیں کہا کہ ایسی بچی عربی نسل یا طرابلسی قوم کے لئے باعثِ فخر ہے۔ کہا یہ کہ فاطمہ خود ہماری بچی تھی۔ وہ صدفِ امتِ مسلمہ کا گوہرِ تابدار تھی۔ اس لئے اس کا یہ کارنامہ ساری امت کے لئے باعثِ صد شرف و عزت ہے۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی　　ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں　　بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں

اور شاہی مسجد (لاہور) کے صحن میں وہ قیامت بھی تو جنگِ طرابلس ہی کے شہیدوں کی یاد میں برپا ہوئی تھی جس کے تصور سے آج بھی جگر کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شہدائے طرابلس کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے شاہی مسجد میں ایک اجتماعِ عظیم منعقد ہوا جس میں علامہ اقبالؒ سے نظم کی فرمائش کی گئی۔ وہ ان شہداء کے غم سے نڈھال تھے۔ افتاں و خیزاں اسٹیج پر آئے اور اپنے مخصوص ساکانی انداز میں حضور رسالتمآبؐ میں اپنی حاضری کا نقشہ اس طرح کھینچا کہ جب میں خدمت بابرکت میں پہنچا تو حضورؐ نے فرمایا کہ

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا　　ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

توانہوں نے (اقبالؒ نے) بصد احترام عرض کیا کہ

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی　　　تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں　　　وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی

لہٰذا ان حالات میں میں ایسا تحفہ کہاں سے لاتا جو حضورؐ کے شایانِ شان ہوتا۔

مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں　　　جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس پر مجمع کا کیا حال ہوا ہوگا، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اور ۱۹۲۲ء میں جب یونانیوں نے ترکوں کو شکست دی ہے تو اسلامیہ کالج (لاہور) کے میدان میں اقبالؒ نے جس درد و کرب سے اپنی نظم — خضرِ راہ — پڑھی تھی اس کی یاد آج بھی خون کے آنسو رُلاتی ہے۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل　　　خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ　　　جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز

اور انتہائی مایوسی کی اس تاریک فضا میں، اس امیدوں کے شاہزادے نے آخر میں یہ پیغام دیا کہ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ پیغام حیات بخش دیتے وقت، اس دیدہ ور کی نگہ دور رس نے اس انقلاب کو بے نقاب دیکھ لیا تھا جو اس وقت ضمیرِ کائنات میں پہلو بدل رہا تھا اور جس کی رُو سے دوسرے ہی سال، ترکوں نے یونانیوں کو شکستِ فاش دے کر اپنے لئے حیاتِ نَو کا سامان پیدا کر لیا تھا۔ ترکوں کی اس محیر العقول کامیابی پر اقبالؒ طرب و نشاط کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لے کر رقصاں و فرحاں، جس طرح اسٹیج پر آیا اور جوشِ مسرت میں جس ولولہ اور طنطنہ سے اپنی نظم طلوعِ اسلام پڑھی اس کی یاد کبھی دلوں سے محو نہیں ہو سکتی۔ آتے ہی کہا کہ

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی　　　افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا　　　سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

اور —

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے　　　کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

—— (٥) ——

یورپ کی مخالفت

جب تک اقبالؒ نے اسلام کے معیارِ قومیت کے پیغام کو ہندی مسلمانوں تک محدود رکھا اس کے خلاف کوئی ایسا ردِ عمل نہ ہوا۔ اسے محض ایک شاعر کا خواب کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں یہاں کی سیاسی فضا پر اس کا کچھ اثر نہیں تھا۔ لیکن جب اس نے اس پیغام کو دیگر مسلم ممالک تک پہنچایا تو مغربی سیاست کے مہرہ بازوں کے دل میں اس سے طرح طرح کے خطرات نمودار ہوئے۔ ان خطرات کی وضاحت

علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی تھی۔

> مجھے یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتداہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں "افرنگی نظریۂ وطنیت" کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہوگئی۔
>
> (بیان، مولانا حسین احمدؒ کے جواب میں)

یہ تھی مغربی اقوام کی وہ سازش جس کے لئے مُہرہ بانانِ افرنگ 'پیغامِ اقبالؒ' میں خطرہ محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے مفکرین نے گوسفندانہ ہمدردی کے لباس میں اُسے یہ طعن دیا کہ وہ اپنے عالمگیر انسانیت کے پیغام سے ہٹ کر اس قسم کی "فرقہ وارانہ" تنگنائے کی طرف کیسے چلا گیا۔ پروفیسر نکلسن کے نام علامہ اقبالؒ کا خط اس سازش کی غمازی کرتا ہے جس کے جواب میں انہوں نے لکھا تھا۔

> اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ در اصل، اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے۔ اور جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان، عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسان کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فریضہ سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا رہے۔
>
> یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال درست نہیں کہ میں نے محض اس کی محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیوں کہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے ...... (فوز و فلاحِ انسانیت کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ) اس نظریہ کو پہلے ایک ایسی سوسائٹی تک محدود کر دیا جائے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

جس عملی مصلحت کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے اپنے عالمگیر پیغام کو ابتداءً مسلمانوں تک محدود رکھنا ضروری سمجھا، اسی قسم کے تقاضا نے انہیں اس پر مجبور کیا کہ وہ اس دائرے کو، پہلے مسلمانانِ ہند تک محدود کر دیں۔ اس کی وجہ اس زمانے میں ہندوستان میں سیاسی تغیرات کی نمود تھی۔

ہندوستان میں سیاسی تغیرات

انگریز کے اپنے حالات اسے مجبور کر رہے تھے کہ مملکتِ ہند میں زیادہ سے زیادہ اختیارات اہلِ ہند کی طرف منتقل کر دے۔ ہندو نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور وطنیت کی بنا پر نظریۂ قومیت کو عام کرنا شروع کر دیا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ

(۱) ہندوستان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام لوگ، بلا لحاظ مذہب و ملت ایک قوم کے افراد ہیں۔
(۲) حکومت کے اختیارات اس قوم کی طرف منتقل ہوں گے۔
(۳) یہاں جمہوری نظام رائج کیا جائے گا جس میں مملکت سے متعلق تمام فیصلے اکثریت کی آرا سے ہوتے ہیں۔
(۴) اور یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اکثریت ہندو کی تھی اور ہندو ہی کی رہنی تھی۔
(۵) اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کے محکوم رہیں۔

یہ تھا یہاں کے بدلتے ہوئے حالات کا فوری تقاضا جس کی وجہ سے علامہ اقبالؒ کو اپنی تمام تر توجہ مسلمانانِ ہند پر مرکوز کر دینی پڑی اور انہوں نے نہایت شد و مد سے اس حقیقت کو عام کرنا شروع کر دیا کہ وطنیت کے معیار کے مطابق قومیت کی تشکیل اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر ایک منفرد اور مستقل بالذات قوم ہیں اور یہاں کے غیر مسلم ان سے الگ، دوسری قوم کے افراد۔

آپ نے دیکھا برادرانِ عزیز! کہ دو قومی نظریہ نہ تو کسی ہنگامی سیاسی تقاضا کی پیداوار تھا اور نہ ہی اسے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے لئے حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ دو قومی نظریہ اُس دن وجود میں آیا تھا جس دن خدا نے پہلی وحی عالمِ انسانیت کی طرف بھیجی تھی۔ یہ دینِ خداوندی کا اساسی اصول ہے اور توحید و شرک میں خطِ امتیاز۔ اشتراکِ دین کے سوا کوئی بھی معیارِ قومیت ہو، وہ اسلام کے خلاف ہے۔ اقبالؒ نے اس نظریہ قومیت کی نشر و اشاعت یورپ سے واپسی کے بعد شروع کر دی تھی۔ وہ ساری عمر اس پیغام کو عام کرتے رہے۔ ان کے اس پیغام کے مخاطب کسی خاص خطے کے مسلمان نہیں تھے، ساری دنیا کے مسلمان تھے لیکن جب اقبالؒ نے دیکھا کہ

ہندو کی طرف سے مخالفت

ہندوستان میں سیاسی تغیرات اس تیزی سے رونما ہو رہے ہیں کہ اگر یہاں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے نظریہ کو خصوصیت کے ساتھ عام نہ کیا گیا تو نیشنلزم کی رو سے یہاں مسلمانوں کا وجود ہی ختم ہو جائے گا تو انہوں نے اس خطۂ زمین کو اپنے پیغام کا اولین مخاطب قرار دے دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اگر ہم یہاں اس نظریہ کو عمل میں لانے کے قابل ہو گئے تو یہ چیز باقی ممالک اسلامیہ کے لئے نظیر بن جائے گی اور اس طرح یہاں کی مسلم قوم عالمگیر امتِ مسلمہ کی تشکیل کے لئے ذرۂ اولین (FIRST - CRYSTAL) کا کام دے گی۔

جب ہندو نے دیکھا کہ اقبالؒ کا یہ پیغام کس طرح ان کے اس خواب کو جس کی رو سے وہ مسلمانانِ ہند کو ابدی طور پر اپنا محکوم رکھنا چاہتا تھا، خوابِ پریشاں بنا دے گا تو اس نے اس کی مخالفت کی اور سخت مخالفت۔ اقوامِ مغرب مسلمانانِ عالم کے امتِ واحدہ بن جانے میں اپنے استعمار کے لئے خطرہ محسوس کرتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اسے مذہبی جنون (FANATICISM) کہہ کر اس کی مذمت اور مخالفت کی۔ ہندو نے مسلمانانِ ہند کے ایک الگ اور منفرد قوم کی حیثیت اختیار کر لینے میں اپنے سیاسی تغلب کے منصوبے بکھرتے دیکھے، اس لئے اس نے بھی اس کی مخالفت کی۔ یہ ہے ہندوستان میں نیشنلزم اور دو قومی نظریہ کی کشمکش کی تمہید۔ یاد رہے کہ دو قومی نظریہ کی مخالفت ہندو کے نزدیک تو یکسر سیاسی نوعیت کی تھی، لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس نظریہ پر اصرار ان کے دین کا تقاضا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دینی تقاضا کے پورا ہوتے سے انہیں سیاسی مفاد بھی حاصل ہو جاتے تھے ــــ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں ملت کے سیاسی مفادات اتباعِ دین کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں، اسی لئے ان کی دنیا ان کے دین سے الگ نہیں ہوتی۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ ہندوستان میں نیشنلزم اور دو قومی نظریہ کی یہ جنگ کیسے لڑی گئی۔

(۱)

یہ حقیقت بڑی جگر پاش اور اس کا تذکرہ بڑا جانسوز ہے کہ مخالفین نے جب بھی اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا تہیہ کیا تو اس مقصد کے لئے انہیں خود مسلمانوں میں سے آلۂ کار مل گئے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، دو قومی نظریہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے تھا، اور ہندو کی طرف سے اس کی مخالفت سیاسی وجوہ پر تھی۔ لیکن اسے خود ہندی مسلمانوں میں ایسے لوگ

نیشنلسٹ مسلمان

مل گئے جو اس نظریہ کی مخالفت میں ہندوؤں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ ان میں بعض لوگ تو محض سیاسی حیثیت کے حامل تھے اور سیکولر حکومت کے قائل۔ ان کی طرف سے اس نظریہ کی مخالفت قابلِ فہم تھی اگرچہ یہ امر موجبِ تاسف تھا کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ المناک اور زہرہ گداز یہ سانحہ تھا کہ ان مخالفین کی قیادت مذہبی پیشواؤں یعنی نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ہندو مطمئن تھا کہ مسلمان اپنے جس دعویٰ کو مذہب کی بنیادوں پر پیش کر رہے ہیں اس کی مخالفت خود انہی کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ یہ مخالفت اپنے انتہائی نقطہ پر اس وقت پہنچی جب شروع ۱۹۳۸ء میں، (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے دہلی کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں۔"

معرکۂ دین و وطن

ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم (دیوبند) کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جا سکتا۔ علامہ اقبالؒ اس زمانے میں یوں کہئے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے اس نعرۂ جاہلیہ کو سنا تو ان کے دلِ صد چاک سے ایک آہ ابھری۔ جو ان الفاظ کی شکل میں، فضا کو چیرتی ہوئی آنسو سے افلاک تک جا پہنچی کہ:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمدؔ ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقام محمدِؐ عربی است

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں "بمصطفیٰؐ برساں خویش را" کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن امت کی تشکیل اس رسولؐ کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے، اسلام کے پیرو امتِ محمدیہ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پا جائے تو رسولؐ سے نسبت ختم ہو جاتی ہے۔ اور جب رسولؐ سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں، اس حقیقت پر قرآن کی وہ آیۂ جلیلہ شاہد ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ۔ (۶/۱۶۰) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کریں اور اس طرح الگ الگ گروہ، پارٹیاں، قومیں بن جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ یعنی اگر قومیت کی اساس، رسول اللہؐ کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا رسولؐ سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے، رسول اللہؐ سے رشتہ منقطع ہو جاتا

ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت کی نسبت وطن کے بجائے حضور نبی اکرمؐ کی طرف کرو۔ بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔۔۔ اگر باو نرسیدی ۔۔۔ اگر تم نے اپنی نسبت حضورؐ کی طرف نہ کی تو ۔۔۔ تمام بولہبی است ۔۔۔ پھر دین باقی نہیں رہتا۔ بولہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کی یہ تنبیہہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنیؒ اور ان کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیئے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کے بجائے مولانا مدنیؒ نے اپنے دعوے کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو معرکۂ دین و وطن کے نام سے مشہور ہے اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابل تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ مرور زمانہ سے یہ دستاویز بالعموم نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے اور پاکستان میں وطنیت کی تحریک پھر سے بانداز نو ابھاری جا رہی ہے اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے اہم حصے سامعین کے گوش گذار کر دیئے جائیں۔ ان حقائق کی اہمیت کے پیش نظر ان اقتباسات کی طوالت کے لئے مجھے معذرت خواہ ہونے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ علامہ اقبالؒ نے سب سے پہلے یہ کہا کہ

> مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامقبول و مردود ہے

اس کے بعد انہوں نے فرمایا:۔

> کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے پیغمبر تھے[1] جن کی وحی میں قوموں، نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا۔ نوع آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی ۔۔۔ یعنی موحد اور مشرک۔ اس وقت سے صرف دو ہی ملتیں دنیا میں ہیں، تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوتِ ابراہیمیؑ اور دعوتِ اسماعیلیؑ سے غافل ہو گئے۔ قوم اور قومیت کی بدا اوڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی تھی۔ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۔ (۲/۱۲۷-۱۲۸) کیا خدا کی بارگاہ سے امتِ مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی حصہ کسی عربی۔ ایرانی۔ افغانی۔ انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا۔ امتِ مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ الکفر ملۃ واحدۃ کی ہے۔

اس اصولی حقیقت کی وضاحت کے بعد کہا۔

> اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابل قدر تھا تو رسول اللہؐ کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے

---

[1] "سب سے پہلے پیغمبر" صرف اس اعتبار سے کہ آپ نے تعمیر کعبہ سے امتِ مسلمہ کے لئے ایک محسوس مرکز کی بنا رکھی، ورنہ دو قومیتوں کی بنیاد تو خدا کی طرف سے اولیں وحی نے رکھ دی تھی جو حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے کی بات ہے۔

پیغامِ کیوں ہوتی۔ کیوں نہ رسول اللہ نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔۔۔۔۔ محمدؐ (فداہ ابی وامی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمدؐ کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے' وہ سب امتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے، اب ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا

کسے کو پنجہ زد ملکِ نسب را ۔۔۔ نہ داند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے' محمدؐ ۔۔۔ نہ دادے دعوتِ دیں بولہب را

حضور رسالتمآب کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ بولہب یا بوجہل یا کفارِ مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو' ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے' ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر حضورؐ (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی' نبی آخر الزماں کی راہ نہ ہوتی۔

آپ نے غور فرمایا' برادرانِ گرامی قدر! کہ علامہ اقبال نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریہ قومیت کو کس قدر اجاگر اور نکھار کر بیان کر دیا ہے۔ لیکن ابھی اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن امت کی تشکیل اس نبی کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا ہوں' لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے آج پھر دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ امت کی یہ تشکیل اس رسولؑ کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جسے سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے۔ مثلاً ایک عیسائی حضرت عیسےٰؑ اور ان سے پہلے کے جملہ انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ حضرت عیسےٰؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے یعنی نبوت کو حضرت عیسےٰؑ کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے' اس لئے وہ امتِ حضرت عیسےٰؑ کا فرد (یعنی عیسائی) کہلاتا ہے۔ لیکن جونہی وہ حضرت عیسےٰؑ کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمدؐ رسول اللہ) پر ایمان لے آتا ہے' وہ امتِ عیسوی سے کٹ کر ایک نئی امت یعنی امتِ محمدیہ کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی اصول کی رُو سے' اگر کوئی شخص محمدؐ رسول اللہ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ امتِ محمدیہ سے کٹ کر ایک نئی امت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ جس طرح رسول اللہ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ امتِ محمدیہ سے کٹ جاتا ہے۔ اسی طرح وطن یا نسل کو قومیت کی اساس قرار دینے سے بھی امتِ محمدیہ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا۔ انہوں نے کہا کہ

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمدؒ یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں "انکارِ خاتمیت" کا نظریہ۔ وطنیت کے حامی بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابد الآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا

نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور ذاتِ رسالتمآبؐ سے اپنا رشتہ منقطع کر کے ایک جدید امت یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنے اس بیان میں متنبہ کیا تھا کہ

اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگی اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی۔

آنے والا مورخ جب اس دور کی تاریخ پر نگاہ ڈالے گا تو وہ یہ دیکھ کر یقیناً محوِ حیرت رہ جائے گا کہ علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ وطنیت کی اساس پر قومیت کا تصور اسلام کی اصولی تعلیم کے خلاف ہے، تو اس حقیقت کو نہ دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی سمجھے اور نہ ہی دیگر نیشنلسٹ علماء (جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور علمائے مجلس احرار جیسے نامور مذہبی راہ نما سب شامل تھے) لیکن اسے سمجھا تو ہندو راہنماؤں نے سمجھا۔ چنانچہ جس زمانے میں متحدہ قومیت کا مسئلہ بحث و نزاع کا مرکز بن رہا تھا، لالہ لاجپت رائے نے (جو اسی لاہور کے رہنے والے بڑے متشدد ہندو تھے) مسٹر سی۔ آر۔ داس کو ایک خط میں لکھا۔

ہندو لیڈروں کا اعتراف

(جو اخبار مرہٹہ کی ۲ فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) کہ:۔

ایک اور چیز جو کچھ عرصے سے میرے لئے بے حد وجہِ اضطراب ہو رہی ہے ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور و فکر دوں۔ گزشتہ چھ ماہ میں میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ یہ چیز (یعنی ہندو مسلم اتحاد) ایک امرِ محال اور ناقابلِ عمل شئے ہے...... میں تہِ دل سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں۔ اسکے لئے میں مسلمان راہنماؤں پر اعتماد کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کریں گے؟ مسلمان راہنما ان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔

لیکن مسلمانوں کے مذہبی راہ نماؤں نے سینہ تان کر کہا کہ قرآن و حدیث کے احکام پر خطِ تنسیخ کیوں نہیں کھینچا جا سکتا! ہم ہزار برس سے یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں۔ اب بھی یہی کریں گے۔

لالہ لاجپت رائے کے اسی خیال کی تائید میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن مسٹر این۔ سی۔ دت نے اپنی کھلی چٹھی میں (جو اخبار مدینہ کی یکم فروری ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی) لکھا کہ

ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری سانس تک، مسئلہ قومیت کی اسلامی نقطۂ نگاہ سے وضاحت

کرتے رہے اور اسی کی بنیاد پر انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا۔ وہ ملتِ اسلامیہ کو یہ پیغام دیتے دیتے عالمِ جاوداں کی طرف سدھار گئے اور اس شمع کو ایسے ہاتھوں میں دے گئے جن کی امانت و دیانت پر انہیں پورا پورا اعتماد تھا۔ یہ ہاتھ تھے، اللہ کے بندے محمد علی جناح کے، جنہیں ملتِ اسلامیہ نے قائدِ اعظم کے برجستہ، موزوں ترین اور ان کے شایانِ شان لقب سے پکارا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

میں نے شروع میں کہا ہے کہ اقبال ہندوستان سے گیا تو "میرا وطن، میرا وطن" کہتے ہوئے اور انگلستان سے واپس آیا تو اس نظریۂ وطنیت کو انسانیت اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن اور ابلیس کی اختراع قرار دیتے ہوئے۔ اقبال کی زندگی میں یہ انقلاب بڑا تحیر انگیز ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ حیرت افزا اور تعجب انگیز ہے وہ انقلاب جو محمد علی جناح کی زندگی میں رونما ہوا۔

جناح کی زندگی کا عظیم انقلاب

وہ نہ صرف یہ کہ عقیدہ وطنیت پر نظری طور پر اعتقاد رکھتے تھے بلکہ عملاً بھی ان کا شمار کانگریس کے بلند ترین راہنماؤں میں ہوتا تھا۔ بمبئی کا "جناح کانگریس ہال" آج بھی ان کے عقیدۂ وطنیت کی یاد تازہ کراتا ہے۔ حیرت ہے کہ اقبال کی نگہ دوربیں نے کیسے بھانپ لیا کہ مسلمانوں کے لئے دو قومی نظریہ کی بنا پر ایک جداگانہ مملکت کا حصول اس شخص کے ہاتھوں ممکن ہوگا جو اس قدر کٹر وطن پرست اور صفِ اول کا کانگریسی تھا۔ اسے کہتے ہیں دیدہ وری اور مومنانہ فراست! قائدِ اعظم کے سوانح حیات کا مرتب ہکٹر بولیتھو (HECTOR BOLITHO) اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ "اپنے قیامِ انگلستان کے دوران مسٹر جناح نے اقبال سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ نہایت اچھے دوست تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناح نے اقبال کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہ کیا۔ اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔" (ص ۹۹) معلوم نہیں اقبال نے کس کس طریق سے جناح کو (CONVERT) کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کی کوششیں جلد نتیجہ خیز نہ ہوئیں لیکن انہوں نے دامنِ امید کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں جناح کی ذات پر کس قدر بھروسہ اور اپنی مساعی کے بارآور ہونے پر کس قدر یقین محکم تھا۔ برسوں کی کوششوں کے بعد انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو جناح کو وہ خط لکھا جو ان کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ

> "میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف انسان ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا آپ پر گراں نہیں گذرتا ہوگا۔ میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے کہ میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔" (ص ۱۱۵)

یہ تیر اقبال کے قلب سے نکلا اور سیدھا جناح کے دل میں پیر گیا۔ اور پھر اقبال اپنے پیغام کی شمع جناح کے ہاتھوں میں دیکر نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ یہ کہتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا کہ

بیں از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے!

میرے نزدیک مسٹر جناح میں یہ نظری تغیر پیدا کرنا، اقبال کا اتنا بڑا احسان ہے جس سے ملتِ اسلامیہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

نوٹ: یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کی الگ مملکت کا جو تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا، اسے قائد اعظم نے ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کی شکل میں متعین کر دیا۔

قائداعظم نے اس جنگ کو دس سال تک جاری رکھا اور بالآخر نہ صرف ہندوؤں سے بلکہ ساری دنیا سے اس حقیقت کو منوالیا کہ مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر ایک جداگانہ قوم ہیں اور ایک الگ آزاد مملکت کے مستحق۔ چونکہ آج کی نشست میں میرا موضوع علامہ اقبالؒ اور دو قومی نظریہ ہے۔ اس لئے میں اس وقت اس جنگ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جو قائداعظم نے دس سال تک لڑی۔ اس کی تفاصیل میں گذشتہ پچیس سال سے بیان کرتا چلا آرہا ہوں اور آئندہ بھی بتوفیق ایزدی مناسب مواقع پر بیان کرتا رہوں گا کہ یہ جنگ درحقیقت دین و وطن کی آویزش اور کفر و اسلام کا معرکہ تھا جسے بیان کرنا میری زندگی کا مشن ہے۔

قائداعظم نے دس سال تک یہ جنگ لڑی اور بالآخر پاکستان وجود میں آگیا۔ یہاں سے پھر ایک ایسی داستان کا آغاز ہوتا ہے جو سابقہ داستان سے بھی زیادہ حیرت افروز، عبرت انگیز اور اس کے ساتھ ہی جگر سوز اور دلدوز ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، دو قومی نظریہ کی دو شقیں تھیں۔ ایک یہ کہ غیر مسلم اور مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ اور دوسری شق یہ کہ تمام مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر امتِ واحدہ (ایک قوم) ہیں۔ نسل، وطن، زبان، ثقافت وغیرہ کے اختلاف سے یہ مختلف قومیتوں یا گروہوں میں نہیں بٹ سکتے۔ قائداعظم کی وفات ۱۹۴۸ء میں ہوگئی اور اس کے بعد جب مملکتِ پاکستان کے لئے آئین مرتب کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو دنیا یہ دیکھ کر محو حیرت رہ گئی کہ اس میں پہلی شق کو مسترد کر دیا گیا ہے یعنی پاکستان کی حدود میں بسنے والے تمام باشندوں — مسلمانوں اور غیر مسلموں — کو ایک قوم قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف تھی بلکہ اس دعویٰ کے بھی خلاف جس کی بنا پر ہم نے ایک الگ مملکت حاصل کی تھی۔

حصولِ پاکستان کے بعد

اس سے ہم نے وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے دیا اور اس طرح پاکستان کی وجہِ جواز کی خود ہی نفی کر دی۔ یہاں پچیس سال سے آئین سازی کی مہم جاری ہے مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہونا چاہیے لیکن یہ مطالبہ کرنے والوں میں سے آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ وطنیت کی بنیاد پر تشکیلِ قومیت، اسلام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتی ہے۔ یہ اس لئے کہ جانے والوں کی مذہبی پیشوائیت بالعموم ان علماء (یا ان کے شاگردوں) پر مشتمل ہے جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ یہ لوگ وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے کر نہ صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے دوران ان کا (یا ان کے اساتذہ کا) موقف صحیح تھا بلکہ حصولِ پاکستان سے انہیں جو شکست نصیب ہوئی تھی اس کا انتقام بھی لینا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں متحدہ قومیت کی تشکیل سے سب سے زیادہ نقصان مشرقی پاکستان میں ہوا۔ ایک تو اس لئے کہ وہاں غیر مسلموں (ہندوؤں) کی آبادی کثیر تھی، اور دوسرے اس لئے کہ وہاں غیر مسلم بڑی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہاں کی اقتصادیات اور سیاست ان کے ہاتھ میں تھی، مسلمان بچوں کی تعلیم کے نگران بھی وہی تھے۔ تعلیم کی بات چلی ہے تو اس سے ایک اہم نکتہ سامنے آگیا۔ وطن یا نسل کو بنائے قومیت قرار دینے سے قوم کی تشکیل کے لئے کسی قسم کی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر بچہ پیدائشی طور پر اس قوم کا فرد ہوتا ہے لیکن کسی نظریہ کی بنا پر قوم کی تشکیل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کے بچوں کو اس نظریہ کی تعلیم دی جائے۔ ہم نے نہ صرف یہ کہ تعلیم کے اس اہم مقصد سے اغماض برتا بلکہ اپنی نئی نسل کی تعلیم ان لوگوں کے ہاتھوں میں دے دی جو اس نظریہ کے مخالف تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری نئی نسل وہ ذہنیت لے کر ابھری جس کی ترجمانی ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم عزیز الرحمٰن نے اپنے اس خط میں کی تھی جو ۱۹۶۹ء میں وہاں کے اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا رہا کہ مسلمان، مذہب کی بنا پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

ہم شری چیتینا، خودی رام، سبھاش بوس، بجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ

خالد، طارق، موسیٰ اور علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا ـــ یعنی اللہ ـــ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نورالله اور خلیل الله جیسے ناموں پر ریجھ گئے اور ناگی، رکھاگی جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ دیا۔

اس کے بعد انہوں نے لکھا تھا کہ

اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھا رہے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس حصۂ پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کیا تھے۔ کوئی اس کی وجہ اقتصادی استحصال قرار دیتا ہے کوئی سیاسی غلطیاں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ لیکن کسی کی نگاہ اس حقیقت تک نہیں پہنچی کہ اس کا بنیادی سبب ہمارا یہ غلط اقدام اور غلط تعلیم ہے جس کی رو سے ہم نے وطنیت کو معیار قومیت قرار دے لیا ہے۔ جب آپ وطن کو معیار قومیت قرار دے لیں گے تو جس علاقے کے لوگ چاہیں گے اپنے علاقہ کو اپنا وطن قرار دے کر اپنے آپ کو جداگانہ قوم قرار دے لیں گے اور جب وہ ایک الگ قوم بن جائیں گے تو اس کے بعد ان کی جداگانہ مملکت کا دعویٰ اور مطالبہ جائز سمجھا جائے گا۔ ہم مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو رو رہے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ مغربی پاکستان بھی اسی راستے پر چلا جا رہا ہے جس پر مشرقی پاکستان چل رہا تھا۔

مغربی پاکستان میں وطنیت کا تصور

آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۶۹ء میں کراچی کی "عوامی ادبی انجمن" کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس پر منجملہ دیگر "دانشورانِ قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا۔

ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے، وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں ...... ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

یہ پہلی چنگاری تھی جو مغربی پاکستان کے نیستانِ ملت میں پھینکی گئی۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ اس تیزی سے بھڑکی کہ اب اس حصہ پاکستان کا بھی کوئی گوشہ اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔ چونکہ جداگانہ قوموں کے لفظ سے یہاں کے عوام بدکتے تھے اس لئے محض بغرضِ تلبیس "قوموں" کی جگہ "قومیتوں" کی اصطلاح وضع اور اختیار کی گئی ہے۔ یہ محض لفظی فریب ہے ورنہ قومیت سے درحقیقت ان کی مراد قوم ہی ہے۔ مغربی پاکستان میں وطن سے مراد صوبہ لیا جا رہا ہے اور چونکہ یہاں چار صوبے ہیں، اس لئے

عام پروپیگنڈا

چار قومیتوں کا تصور عام کیا جا رہا ہے۔ قوم ہو یا قومیتیں۔ اور پانچ ہوں یا چار۔ مقصد اسلامی معیار قومیت کے بجائے وطنی معیار قومیت کے نظریہ کا عام کرنا اور اس طرح مغربی پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بالآخر اس کے جداگانہ وجود کو ختم کرنا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد مسز اندرا گاندھی نے اپنی فتح کا جشن مناتے ہوئے کہا تھا کہ

یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہماری حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی؛

اس نظریہ پر جو باطل پر مبنی تھا اور جس پر مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔

اس نے اُدھر یہ کہا اور اِدھر خان عبدالولی صاحب نے اعلان فرمایا کہ

دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان غلط تھا۔ (نوائے وقت ۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۷۲ء)

بیٹے نے یہ کہا اور ان کے والد بزرگوار (خان عبدالغفار خان) نے ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ

چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہوگی۔

انہوں نے یہ بات آج ہی نہیں کہی۔ وہ پہلے دن سے نیشنلسٹ ہیں اور ہندوؤں سے بھی زیادہ متشدد نیشنلسٹ۔ وہ اپنے اس عقیدہ کا برابر پرچار کرتے رہتے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں جب وہ کابل سے بھارت گئے ہیں تو انہوں نے وہاں کہا تھا کہ

میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے۔ جب اسلام یا کوئی مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی۔ لہٰذا میں اسے کس طرح تسلیم کر لوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ ہم مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔

(سٹیٹسمین۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۹ء ۔ بحوالہ پاکستان ٹائمز ۲۴/۳ ۱۹۷۳ء)

چار قومیتوں کا نظریہ نیشنل عوامی پارٹی کے منشور میں داخل ہے اور اس کے راہنما اٹھتے بیٹھتے اس کا پرچار کرتے رہتے ہیں ابھی حال ہی (گذشتہ مارچ) میں مسٹر غوث بخش بزنجو نے مرکزی اسمبلی کے ایوان میں اس نظریہ کو دہرایا تھا۔ یہ آواز اب نیشنل عوامی پارٹی یا اس کے ہمنواؤں تک محدود نہیں رہی، ہماری نئی نسل کے ہر نوجوان کے لب پر عام ہو رہی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے پاکستان میں مذہبی پیشوائیت کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے خود (یا ان کے اساتذہ یا مقتداؤں نے) تحریکِ پاکستان کے دوران 'دو قومی نظریہ' کی مخالفت کی تھی۔ اس لئے وہ جب دیکھتے ہیں کہ یہاں نظریہ وطنیت عام ہو رہا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں کہ آخر الامر جیت انہی کی ہوئی۔ جماعتِ اسلامی کا دعویٰ ہے کہ دو قومی نظریہ کے سب سے پہلے داعی ان کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے لیکن مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ انہوں نے کبھی اس کا مطالبہ نہیں کیا کہ یہاں دو قومی نظریہ کو عملی شکل دی جائے بلکہ انہوں نے ۱۹۶۲ء میں انتخابات کے سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے گی تو جماعتِ اسلامی اس کی حمایت نہیں کرے گی۔ کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں۔ اس کے برعکس اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریئے کے مطابق ہونا چاہیے۔ (امروز ۔ ۲۰-۹-۶۲ء)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف خطوں میں بسنے والے لوگوں کا کلچر مختلف ہے۔ اس لئے ان کی قومیتیں مختلف

ہیں۔ کلچر کا لفظ ایسا ہے جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ کلچر کے مدعیوں سے پوچھئے کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کے جواب میں متعین طور پر کچھ نہیں بتا سکیں گے۔ بات سمٹ سمٹا کر خوراک، لباس، تراش خراش، وضع قطع، طرزِ بود و ماند یا فنونِ لطیفہ پہ آجائے گی۔ ان "دانشوروں" کو کون بتلائے کہ جو اسلام وطن، نسل یا زبان کے اختلاف کو بھی جداگانہ قومیت کا معیار قرار نہیں دیتا۔ کیا وہ وضع قطع، تراش خراش یا شعر و نغمہ کے اختلاف کو معیارِ قومیت تسلیم کرے گا؟ قرآنِ کریم اختلافِ رنگ اور زبان (الوان والسنہ) کو بیشک تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ انہیں معیارِ قومیت قرار نہیں دیتا۔ اس نے جماعتِ واحدہ تشکیل کی تھی اس میں عرب، ایران، شام، عراق، روم، مصر، شمالی افریقہ، حبش وغیرہ کے باشندے سب شامل تھے جن میں اسلام لانے سے پہلے کوئی چیز بھی مشترک نہیں تھی۔ اسلام نے ایمان کو قدرِ مشترک قرار دیا تو ان اختلافات کے باوجود وہ سب ایک امت کے افراد بن گئے حالانکہ اس وقت بھی ان کا طرزِ بود و ماند (بقول ان حضرات کے ان کا کلچر) الگ الگ تھا۔ اسلام طرزِ بود و ماند کو نہ چنداں اہمیت دیتا ہے، نہ ہی اس سے تعرض کرتا ہے۔ مختلف ملکوں کے مسلمان اپنا طرزِ بود و ماند الگ الگ رکھ سکتے ہیں لیکن اس اختلاف سے وہ الگ الگ قومیتوں میں نہیں بٹ جاتے۔ اگر کلچر نامی کوئی شے ہے تو وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ایک ہے۔ اس سے مراد اندازِ بود و ماند نہیں بلکہ وہ ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت مراد ہے جو مستقل اقدار کی صداقت پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس ذہنیت کے مظاہر اور ان اقدار کو بروئے کار لانے کے طریق الگ الگ ہو سکتے ہیں لیکن اس کا ان کے ملتِ واحدہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

لیکن ہمارے ان دانشوروں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہ غیر ملکی سیاحوں کو "پاکستانی کلچر" دکھانے کے لئے موہنجو داڑو لے جاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جو کلچر وہاں کے کھنڈرات میں مدفون ہے، وہ پاکستان کے وجود میں آنے سے ہزاروں سال پہلے کا ہے۔ نیز یہ بھی محض اتفاق ہے کہ وہ علاقہ تقسیمِ ہند کے وقت حدودِ پاکستان میں شامل ہو گیا۔ اگر تقسیم کی لکیر ذرا ادھر کھنچ جاتی، تو وہ بھارتی کلچر کا مظہر قرار پا جاتا۔

دو قومی نظریہ کے مدعی

یہ تو ان لوگوں کی کیفیت ہے جو دو قومی نظریہ کی مخالفت کرتے ہیں، لیکن جو اس نظریہ کی تائید اور مدافعت کرتے ہیں بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو وہ بھی اس نظریہ کے بنیادی اصول کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ محض اپنے سیاسی حریفوں کی مخالفت کے لئے ایسا کہہ دیتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دو قومی نظریہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلام میں معیارِ قومیت، وطن کا اشتراک نہیں، دین کا اشتراک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک وطن میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم قرار نہیں پا سکتے۔ چار قومیتوں کے مدعی وطن کو معیارِ قومیت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مختلف صوبے مختلف وطن ہیں اس لئے ہر صوبے کے باشندے، بلا امتیاز مذہب، الگ قوم ہیں۔ دو قومی نظریہ کے مدعی کہتے ہیں کہ پاکستان (یا اب مغربی پاکستان) ایک وطن ہے اور اس میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں۔ فرمائیے کہ اصل کے اعتبار سے ان دونوں گروہوں میں فرق کیا ہے۔ وطن کو بطور معیارِ قومیت دونوں تسلیم کرتے ہیں۔ فرق صرف وطن کی حدود میں ہے۔ ایک گروہ صوبوں کی حدود کو وطن قرار دیتا ہے۔ دوسرا گروہ پورے مغربی پاکستان کو وطن کہتا ہے۔ اسلام کو معیارِ قومیت نہ یہ تسلیم کرتے ہیں نہ وہ۔ یاد رکھئے کہ جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا جاتا کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے - خواہ وہ ایک وطن ہی میں کیوں نہ رہتے ہوں، اس وقت تک دو قومی نظریہ کا دعویٰ حقیقت نہیں بن سکتا۔ دو قومی نظریہ کے حامیوں سے آپ پوچھئے کہ آپ جن دو قوموں کے مدعی ہیں فرمائیے

کہ پاکستان میں وہ قومیں کون کون سی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔

کہا جائے گا کہ مغربی پاکستان میں غیر مسلموں کی تعداد بہت کم ہے اس لئے ان کا یہاں کے مسلمانوں کا ہم قوم قرار پا جانا ہماری سیاست کو متاثر نہیں کر سکتا۔ لیکن سوال سیاست کا نہیں دین کے اصول کا ہے۔ غیر مسلم خواہ ایک ہی کیوں نہ ہو، اگر اسے، اور مسلمانوں کو ایک قوم تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے ایمان کے اشتراک کو نہیں بلکہ وطن کے اشتراک کو معیار قومیت تسلیم کر لیا۔ یہاں کے غیر مسلموں اور مسلموں کو ایک قوم قرار دیدینا، اس متحدہ قومیت کو وجود میں لے آتا ہے جس کی ہم نے تحریکِ پاکستان کے دوران اس شدت سے مخالفت کی اور جو اسلام کے نظریۂ قومیت کی حریف ہے۔ لہٰذا جب تک یہاں غیر مسلموں کو آئینی طور پر مسلمانوں سے الگ قوم قرار نہیں دیا جاتا، دو قومی نظریہ کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھ سکتا۔

(۰)

مسٹر نرادسی چوہدری کا اعتراف

میں نے پہلے کہا ہے کہ جس زمانے میں غیر منقسم ہندوستان میں ہمارے "علمائے کرام" کی طرف سے دو قومی نظریہ کی مخالفت کی جا رہی تھی، ہندو راہنما مثل لالہ لاجپت رائے اور این۔ سی۔ دت یہ کہہ رہے تھے کہ متحدہ قومیت کا تصور قرآن اور حدیث کے خلاف ہے۔ یہ چیز اس زمانے تک محدود نہیں رہی۔ آج جب کہ پاکستان میں دو قومی نظریہ کی اس قدر (بالواسطہ یا بلاواسطہ) مخالفت ہو رہی ہے، ہندوستان میں ایسے ہندو موجود ہیں جو وہاں اس نظریہ کی تائید کر رہے ہیں۔ مسٹر نرادسی۔ چوہدری، وہاں کا بین الاقوامی شہرت کا حامل "قلم کار" ہے۔ اس نے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کی بڑھتی ہوئی لہر سے متاثر ہو کر ۱۹۶۸ء میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس نے وہاں کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ

> میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب دوبارہ کھل کر پورے شد و مد سے مجھے یہ کہہ لینے دیجئے کہ جب تک ہندوستان کی حکومت اور ہندوستان کے ہندو یہ رٹ لگاتے رہیں گے کہ یہاں کے مسلمان ایک متحدہ قومیت کا جزو ہیں، اس وقت تک (ہندو مسلم فسادات کے) مسئلہ کو سلجھایا ہی نہیں جا سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ معاشرے ہیں جو دو الگ الگ تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے اندر یہ اختلاف ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ۔ ۔ اگر میری یہ بات مان لی جائے تو پھر اگلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں۔ (طلوع اسلام۔ بابت جون ۱۹۶۹ء)

یہی بات مسٹر چوہدری نے اس سے پہلے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE CONTINENT OF CIRCE) میں بھی کہی تھی جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ غور کیجئے کہ ہندوستان کا ہندو تو یہ کہہ رہا ہے کہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کے تحت رہنے والے ہندو اور مسلمان "دو الگ الگ قومیں ہیں" اور پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دینے کے مدعی ایک طرف یہاں کے مسلموں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تسلیم کر رہے ہیں، اور دوسری، خود مسلمانوں کو بھی علاقائی تفریق کے اعتبار سے چار قوموں میں تقسیم کر رہے ہیں۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

آئینِ پاکستان میں، خدا خدا کر کے، ختمِ نبوت کے عقیدہ کو مسلمان ہونے کی شرط قرار دے دیا گیا۔ اس کے لئے اس

آئین کے مرتبین مستحق مبارک باد ہیں۔ لیکن یاد رکھیئے بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔

(۱) جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہ رکھی جائے کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم نہیں قرار دیئے جا سکتے، نہ یہ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے، نہ ہمارا آئین اسلامی۔

(۲) جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہیں رکھی جاتی کہ مسلمانوں میں متعدد قومیتوں کا نظریہ اسلام کی ضد اور مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہے، نہ ملتِ واحدہ وجود میں آ سکتی ہے نہ پاکستان محفوظ رہ سکتا۔

(۳) جب تک دو قومی نظریہ کو ہمارے نصابِ تعلیم میں داخل نہیں کیا جاتا، پاکستان کا مستقبل مستحکم نہیں رہ سکتا۔ اور

(۴) جب تک آپ قرآنی نظریۂ پاکستان کو اپنی تقریروں اور تحریروں کا مرکزی موضوع نہیں قرار دیتے، نہ اقبالؒ کی یاد میں اجتماعات منعقد کرنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے، نہ قائد اعظمؒ کے یوم منانے سے کوئی فائدہ۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اگر وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے لیا گیا تو اس کا نتیجہ لادینی ہوگا۔ اور قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اگر ہم نے دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان حاصل نہ کیا تو برصغیر میں نہ مسلمان باقی رہیں گے، نہ اسلام۔ اور آپ مجھے اپنی زندگی کے اس ڈھلتے ہوئے دور میں اس جگر شگاف اور جانسوز حقیقت کو زبان تک لانے کی اجازت دیجیئے کہ اگر ہم نے نظریۂ پاکستان اور اس کے عملی تضمنات کو نظر انداز کر دیا جو درحقیقت قرآن ہی کے نظریۂ حیات کا دوسرا نام ہے تو اول تو یہ مملکت ہی باقی نہیں رہ سکے گی کیونکہ اس کی وجہ جواز ہی ختم ہو جائے گی۔ اور اگر یہ باقی بھی رہی تو یہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ نہیں بن سکے گی جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑے گا کہ وہ اپنے ظہور (غلبہ) کے لئے کوئی اور خطۂ زمین تلاش کرے گا لیکن ہمارا کچھ بھی باقی نہیں رہیگا۔ یہی وہ المیہ تھا جس کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

حق اگر از پیشِ ما بردارَدش پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
ترسم از روزے کہ محرومش کنند آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

یٰلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا

والسلام

طلوع اسلام کنونشن
منعقدہ نومبر ۰۶ء

قسط نمبر ۲

مجلس مذاکرہ

موضوع

ہو فکر اگر خام تو آزادئ افکار ◎ انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

(۷)

مجیبہ فاروقی

میرے محترم باباجی اور سامعین کرام!

باعث صد افتخار ہے یہ بات کہ مجھے آج طلوع اسلام کی اس پاکیزہ اور پُر وقار تقریب میں حصہ لینے کا شرف حاصل ہو رہا ہے کیونکہ اس تقریب میں شمع قرآنی کی بکھری ہوئی کرنیں جب ہر شے کو منوّر کر رہی ہوتی ہیں، تو یہ چیز نہایت ہی وجہِ شادابئ قلب و دماغ ہوتی ہے۔

معزز سامعین! چھ ہی ماہ پہلے اسی تقریب میں نوعِ انسانی کی عبرتناک اور الم انگیز تاریخ، اس کی اندوہناکیوں محرومیوں اور ظلمت کی تاریک ترین چادر میں لپٹی ہوئی انسانیت کی تاریخ ایک مصرعہ میں سمو دی گئی تھی کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

لیکن آخر ایسا کیوں تھا؟ آدمی کا مقامِ انسانیت پر پہنچنا تو کجا وہ مقامِ آدمیت سے نیچے بھی کیوں گرتا جا رہا تھا؟ اس کی وجہ چشم و گوش کے حامل انسان کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ یہ عقل و فکر کی صلاحیت تھی جس سے انسان کو نوازا گیا تھا جس سے یہ حیوان سے متمیز کیا گیا تھا، کی نابختگی تھی، خامی تھی اور اس کی بے باکی تھی۔ انسان چشم، گوش اور قلب رکھتا تھا۔ مگر ان سے دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے کا کام نہ لیتا تھا۔ حالانکہ انسان سمع، بصر اور قلب کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ جو لوگ ان قوتوں سے کام نہیں لیتے وہ شرفِ انسانیت حاصل نہیں کر سکتے بلکہ ان کی زندگی حیوانی سطح پر آ جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے کی صلاحیت ہی مفقود ہو جاتی ہے۔ اس سے بڑا ستم اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشو و نما رک جاتی ہے۔ اور اس کی نظروں سے عظیم انسانی مقاصد اور فرائض اوجھل ہو جاتے ہیں۔

معزز سامعین! مجھے اپنے ایک قرآنی بھائی کا سنایا ہوا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ ان کے ایک دیہاتی اور زمیندار قسم کے دوست نے بیلوں کو چارہ ڈالا۔ انہوں نے اپنے دوست سے کہا کہ بھئی ان بیلوں کو ایک دوسرے سے ذرا دور باندھو تاکہ یہ چارہ ان کے لئے باعثِ تنازعہ نہ بنے۔ اس پر وہ

کہنے لگا کہ نہیں دوست یہ انسان بھول رہے ہیں۔ یہ تو انسانوں کا شیوہ ہے جو نہ صرف دوسرے کا حق مار لیتے ہیں بلکہ زاید از ضرورت چارہ ذخیرہ کر لیتے ہیں اور حیوانات اس سلسلہ میں ہم انسانوں سے زیادہ مشرف ہیں جو بقدرِ ضرورت چارہ کھا کر باقی دیگر حیوانات کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔

عقل و فکر سے عاری یا خامیٔ فکر کی بدولت ہی انسان کی ذہنیت حیوانوں سے کہیں گھٹیا ہو جاتی ہے۔ اس کی گھناؤنی، غیر متوازن، لعنت کے بکھیڑوں میں الجھی ہوئی اور رسوم و روایات کے پھندوں میں گرفتار معاشرتی زندگی خامیٔ فکر اور اس کی بے باکی کی وجہ سے ہے۔ دل خاک یہ سوچ سوچ کر دیوانہ ہو رہا ہے کہ کیا یہ ذہنیت انسان کی ہے؟ جس نے ۹۰ ہزار سپاہیوں کو قید کر کے کس بے دردی سے چالاک و مکار ہندو کے آگے ڈال دیا۔ وہ ہندو جس میں انسانیت کا ذرہ تک نہیں۔ اور پھر یہ آج ہی کے دور کی المناک حقیقت نہیں۔ ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ابتدائی ایام میں ہی انسان نے انسان پر جو ظلم و ستم کئے۔ اس کی خون فشانیاں اور سوختہ سامانیاں تاریخ کے صفحات پر ریت کے ذرات کی طرح بکھری پڑی ہیں۔

کشتِ بلند فکر سے اگی ہوئی سبزہ زار خلافتِ راشدہ کے بعد، زمین کو بنجر کر دیا گیا، چراغوں میں روشنی نہ رہی ملوکیت، استبدادیت، چنگیزیت اور رہبانیت کی خامیٔ فکر سے تباہی و بربادی کی دلخراش داستان سنائی۔ ذہنِ انسانی کے ساختہ شدہ جمہوری نظام کی بدولت بھی انسان بیمار اور متعفن فضاؤں میں پیدا ہو کر سسکیوں آہوں اور بھوک و افلاس کی چکی میں پس رہا ہے۔ اس کی انفرادی صحت کا یہ حال ہے کہ گھٹتے گھٹتے پانچ فٹ کا رہ گیا ہے۔ دو قدم چلتا ہے تو ہائے ہائے کرنے لگتا ہے۔

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر!
دیکھا نہیں جاتا، مگر دیکھ رہا ہوں

اور پاکستان کا مسلمان جب یورپ والوں کے جوتے صاف کر کے چند ٹکے کما لیتا ہے تو قہقہہ لگا کر کہتا ہے کہ "ولایت کی مزدوری پاکستان کی افسری سے اچھی ہے۔" علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

لیکن اپنے سے بھی گلہ کیوں ہو؟ اپنی تو کوئی خطا نہیں، یہ سب کیا دھرا تو بدبخت تقدیر کا ہے۔ ظالم نے کیسے اپنے کو بری کر لیا۔ حقیقت میں ہماری تباہیوں کے اسباب میں ایک بنیادی سبب تقدیر کا غیر قرآنی عقیدہ ہے۔ اس غارت گر دین و دانش عقیدے نے سراپا عمل و حرکت قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور عقل و فکر کی قوتوں کو ہی سلب کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں لقمان حکیم کا واقعہ یاد آ جاتا ہے فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے پاس عقل آئی میں نے پوچھا کہ تو کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔ کہنے لگی کہ میں عقل ہوں اور سر میں رہتی ہوں پھر میرے پاس شرم آئی۔ میں نے وہی سوال کیا کہ تو کون ہے اور کہاں قیام ہے۔ کہنے لگی کہ میں شرم ہوں اور چشم میں رہتی ہوں اور آخر میں تقدیر آئی میں نے پھر وہی استفسار کیا تو فرمایا کہ میں تقدیر ہوں اور سر میں رہتی ہوں۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ وہاں تو عقل کا قیام ہے۔ کہنے لگی کہ جب میں آتی ہوں تو عقل وہاں سے رخصت ہو جاتی ہے۔

معزز سامعین! خامیٔ فکر اور اس کی آزادی کی بدترین مثال ہمارا نظامِ سرمایہ داری ہے جس نے انسانی زندگی کو نہ صرف بار دوش بنایا بلکہ انسانی صلاحیتوں کو کچل کے رکھ دیا۔ ہمارا نظامِ معیشت جہاں چار پیسے عنایت کرتا ہے تو اسی کو غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ تیسری کلاس کے بچے سے پوچھا کہ بھئی بتاؤ تو قرآنِ حکیم کے کیا فوائد ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ ہم بڑے ہو کر اگر نوکری نہ ملے تو مولوی تو بنا جا سکتا ہے۔

یورپ خود کو فکر و عمل کی فضا میں پرواز کرتا ہوا محسوس کرتا ہے اور دعویدار ہے کہ اس نے کائناتی قوتوں کو مسخر کر لیا ہے اور یہ کہ اگر وہ تقریر کرنے کے لئے انگلی اٹھاتا ہے تو اس کے اشارے مریخ پر ہوتے ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ خود یورپی مفکر J. W. T. MASON اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"ہم نے زندگی کی ابتداء سائنس کی کاریگری سے کی۔ اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں، زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں"۔

نتیجہ یہ کہ ؎

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطرے میں ہے اس کا آشیانہ

حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان کسی فطری قوت سے متعلق قانون کا علم حاصل نہیں کر لیتا وہ قوت سرکش و بیباک رہتی ہے اور انسان کے لئے تباہیوں کا موجب بنتی ہے لیکن جب قانون کا علم حاصل کر کے اسے مسخر کر لیا جاتا ہے تو وہ تعمیری نتائج پیدا کرتی ہے جس طرح بارش کا پانی اگر انسانی کنٹرول میں نہ ہو تو سیلاب بن کر تباہیاں لاتا ہے۔ لیکن جب ساحلوں میں مقید ہو جاتا ہے تو زمینِ مردہ کے لئے حیاتِ تازہ لاتا ہے۔

سامعین کرام! علامہ اقبالؒ کہ جن کو فطرت نے فکر و تدبر کی عظیم ترین صلاحیتوں سے نوازا تھا، زمانے کی افکار کی خامی اور اس کی آزادی سے پیدا شدہ تباہیوں سے تنگ آ کر کہہ دیا تھا کہ ؎

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام

لیکن باعثِ صد افتخار ہے یہ مقام کہ اس زمانے میں بھی آج سے چودہ سو سال پہلے کا قرآن جو محمد عربیؐ کی وساطت سے ملا تھا اور جس نے انسان کو نہ صرف سوچنا سمجھنا سکھایا بلکہ اس کی عقل و فکر کی صلاحیت کو صحیح سانچے میں ڈھالا قرآن ہی وہ ایجنسی ہے کہ جہاں فکرِ خام اور بے باک رہنے کی بجائے پختہ تر ہوتی ہے اور خدا ہمارے اس عظیم رہنما کو سلامت رکھے کہ جو

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
یہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

———(۰)———

(۸)

گوگی

میرے بزرگو! پچھلی کنونشن میں میں نے ایک فقرہ کی تقریر کی تھی۔ اس دفعہ میری تقریر دو فقروں کی ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ

آپ کہہ رہے ہیں کہ فکرِ خام سے انسان حیوان بن جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ سن کر اگر حیوانوں نے آپ پر ہتکِ عزت کا دعویٰ کر دیا تو اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہوگا؟

———(۰)———

(۹)

رانی

میرے بزرگو بسلام

میں نے ایک دن کچے چاول کھائے تو میرے پیٹ میں درد ہونے لگ گیا۔ باباجی نے کہا کہ اگر پکے ہوئے چاول کھاتی تو درد نہ ہوتا۔

میں تو اس مذاکرہ سے اتنا ہی سمجھ سکی ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

———(۰)———

(۱۰)

شاہد واثق مجید۔

صاحب صدر اور معزز حاضرینِ مذاکرہ! السلام علیکم۔

دنیا کے تمام مذاہب میں ایک قدرِ مشترک نہایت اہم ہے جس کے بغیر کوئی مذہب مذہب نہیں بنتا۔ وہ قدرِ مشترک یہ ہے کہ دنیا کا ہر مذہب سب سے پہلے عقل کے دیئے گل کرتا ہے۔ دنیا کے ہر مذہب نے "پہلا کارنامہ" یہی سرانجام دیا ہے کہ لوگوں کو راضی برضا اور تقدیر کا خوگر بنا دیا۔ مذہبی پیشوائیت کے فیصلوں پر تنقید تک کرنا جرمِ عظیم قرار دیا اور جہاں جہاں مذہب کے اجارہ داروں کا بس چل سکا انہوں نے مذہب پر غور و فکر کرنے والوں کو سخت ترین سزائیں دیں۔ یہ بات ہر زمانہ پر لاگو ہوتی ہے خواہ وہ زمانہ قبل از مسیح کے یروشلم کا ہو، گلیلیو کے یونان یا خلیفہ ہارون الرشید کے عراق و شام کا۔

تاریخ کے ہر ورق پر مذہب کی عقل دشمنی کی شہادتیں اور نشانیاں بکھری پڑی ہیں۔ اسلام جب مذہبی پیشوائیت کے ہتھے چڑھا تو اس کا بھی وہی حشر ہوا جو باقی انبیاء کرام کی انقلابی تعلیمات کے ساتھ ہوا تھا یعنی اسلام بھی رفتہ رفتہ ایک ترقی پذیر دین مردانِ خود آگاہ سے مذہبِ ملا و جمادات و نباتات میں تبدیل ہو گیا۔

لیکن تا بہ کے۔ آخر کار گلیلیو اور سر سید جیسے مردانِ حُر نے مذہبی پیشوائیت کی ان زنجیروں کو توڑنا شروع کر دیا اور یہ انہی باہمت لوگوں کے طفیل ہے کہ آج کا دور عموی طور پر آزادیٔ فکر کا دور کہلاتا ہے۔ یورپ میں یہ دور مدت ہوئی شروع ہو چکا اور آج اپنے عروج پر ہے۔ مذہب کو گرجوں میں مقید کرنے کے بعد یورپ نے اپنی کشتِ زندگانی کی بار آوری کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں عقل کا سہارا لیا۔ ایشیا یورپ کی تقلید میں کم و بیش...

ڈیڑھ سو سال پیچھے رہا۔ چنانچہ تقریباً سو سال قبل یورپ مذہبی برگشتگی کے جس تجربہ سے گزرا ہم آج اسی تجربہ کے شکار ہیں۔ یہ ہے وہ پس منظر جس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں آج اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر آج کی نوجوان نسل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

مذہب سے برگشتگی کوئی نئی چیز نہیں بلکہ ملّا کا مذہب تو ہے ہی اس قابل کہ ہر عقلِ سلیم اس سے برگشتہ ہو جائے لیکن ہمارے ہاں ہوا یہ کہ عقل کو جب مذہبی پیشوائیت کے شکنجے سے آزادی ملی تو ایک دبے ہوئے سپرنگ کی طرح جسے اچانک رہا کر دیا جاتا ہے، عقل اپنی دوسری انتہا تک پہنچ گئی اور اس طرح پاکستان کی نئی نسل مکمل آزادیٔ فکر کے نعرہ سے روشناس ہوئی۔ اس کے بعد کسی بھی شئے کو عقل سے بلند تصور کرنا انسانیت کی تذلیل ٹھہرا۔ چنانچہ یہاں تک یہ سمجھا جانے لگا کہ بقولِ لینن :-

عقلِ انسانی اس قابل ہے کہ ہمیں صداقتِ مطلق کا علم دے سکے۔ چنانچہ اس نے (یعنی عقل نے) یہ علم دے دیا ہے۔

اور اس کے بعد دنیا بقولِ ہیگل ——"سر کے بل کھڑی ہو گئی"!

ہمارے نوجوانوں میں بھی مذہبی برگشتگی تعلیم کے ساتھ دبا کی طرح پھیلی۔ تعلیم نے نوجوانوں کو تجزیہ کرنے کی قوت دی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے نظام نے نوجوانوں کو یورپ کی خودساختہ انسانی اقدار اور شخصی آزادی کا سبق دیا۔ میرے مشاہدہ کے مطابق ان جدید اقدار کے نتیجہ میں پاکستانی نوجوانوں میں بنیادی طور پر دو طرح کا طرزِ فکر پیدا ہوا ہے۔

کچھ نوجوانوں نے یورپ سے انسانی آزادی کا سبق سیکھا اور اس سبق کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب انہوں نے مسلمانوں کی مروجہ تاریخ کا مطالعہ کیا تو انہیں۔ بیشمار مسلمان خلفاء اور شیوخ کے حرم لونڈیوں اور غلاموں سے بھرپور نظر آئے اور یہ صورتِ حال آج بھی موجود ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

کچھ نوجوانوں نے یورپ سے مادہ پرستی (MATERIALISM) کا سبق سیکھا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کا واحد مقصد تحفظ اور پرورشِ خویش کے سوا اور کوئی نہیں رہ گیا۔ ان کے معاشرتی تعلقات میں خالص کاروباری نقطۂ نظر کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اور ان کا نظریۂ حیات یہ بن گیا ہے کہ "زندگی یہی کچھ ہے۔ کھاؤ۔ پیو اور مزے اڑاؤ"۔ اور مزے اڑانا آج کے نوجوان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

ہر پرانی چیز سے سرکشی آج کے نوجوان کی فطرت ہے۔ یہ اپنی ہی املاک کی توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ سب اسی فکری بے راہ روی کا نتیجہ ہیں جس کا آج کی نوجوان نسل شکار ہے۔ نوجوانوں کی بے مقصد آزادیٔ افکار کی حالت یہ ہے کہ آج کا نوجوان اتنی پابندی قبول کرنے پر بھی تیار نہیں کہ اسے سڑک کے بائیں طرف چلنا چاہیئے اور سرخ ٹریفک سگنل پر رک جانا چاہیئے۔ وہ ان تمام قواعد کو اپنی شہری اور شخصی آزادی کے خلاف گردانتے ہیں۔

آج نئی نسل ہر شئے توڑنے پر تلی ہوئی ہے خواہ وہ ٹریفک کا قانون ہو، یا ضابطۂ اخلاق، کارخانہ ہو یا کھلیان۔

آج کا نوجوان آزادیٔ فکر و عمل پاکر بے حد خوش ہے لیکن میرے مشاہدہ کے مطابق ہماری نوجوان نسل کا عقل اور جذبات کے مابین توازن بگڑ چکا ہے اور ہمارے نوجوانوں کی عقل کی حدود وہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جہاں ذاتی اور جذباتی خواہشات کی حدود ختم ہوتی ہیں۔ اگر میرے نوجوان ساتھی خود ہی کچھ مزید غور و فکر کی زحمت

گوارا کریں تو ان پر واضح ہو کہ وہ ملّا کی غلامی سے نکل کر اپنے نفس کی غلامی میں چلے گئے ہیں اور ان کے سرکش جذبات ہر مقامِ ہوش پر ان کی نام نہاد آزادِ فکر کی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہیں۔

آزادیِ فکر بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں، ہر چیز کا عقلی تجزیہ کرنا انسان کے انسان ہونے کا ثبوت ہے۔ غلط اور صحیح، اور اچھا اور بُرا میں امتیاز کر سکنے کی صلاحیت ہی امتیازِ انسانیت ہے۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے سامنے جو کچھ پیش کیا جائے وہ اسے اختیار کرنے سے پہلے اس کا ہر پہلو سے جائزہ لے اور اسے ہر ممکن طریق پر پرکھے لیکن اس سلسلے میں ایک بات پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے۔ انسانی معاشرہ میں ہر شخص کا عمل اور سوچ سارے سماج کو متاثر کرتی ہے۔ اگر انسانی معاشرہ میں ہر شخص الگ الگ صرف اپنے ہی فائدہ کے لئے سوچے اور اس پر عمل کرے تو معاشرہ کی ترقی یقیناً رک جائے گی۔ ایسے معاشرہ کی مثال ایک ایسے ڈبے کی سی ہوگی جس میں ہوا کے اربوں ذرات اس معاشرہ کے افراد کی طرح موجود ہوں۔ سائنس کی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان ذرات میں سے ہر ذرہ مسلسل حرکت میں ہوتا ہے مگر مجموعی طور پر ڈبا اپنی جگہ ساکن رہتا ہے۔

آپ یقیناً اس بات سے اتفاق کریں گے کہ پاکستان کی نئی نسل کی فکری بے راہ روی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں اور راہنماؤں نے کبھی ذاتی مفادات سے بلند ہو کر قوم کے سامنے کوئی نصب العین رکھنے کی کوشش نہیں کی تاکہ ساری قوم مل جل کر ایک ہی سمت میں سوچ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی سوچ آج ہمہ سمت سے بکھرا ہے میرے اکثر نوجوان ساتھی اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ان کے سامنے زندگی کا کوئی اجتماعی مقصد موجود نہیں جس کے متعلق وہ تعمیری طور پر سوچ سکیں۔

انفرادی طور پر بے مقصد آزادیِ فکر کی مثال ایک آوارہ گرد شخص کی سی ہے جبے لگام آزادیِ فکر ذہنی آوارہ گردی ہے۔ ایک آوارہ گرد چلتا ضرور ہے اور تھکتا بھی ہے مگر منزل اس سے اتنی ہی دور رہتی ہے جتنی دور آوارہ گردی شروع کرنے سے پہلے تھی عین اسی طرح بغیر نصب العین کے آزادیِ فکر میں انسان سوچتا ضرور ہے اور توانائی بھی صرف کرتا ہے مگر منزل اس کے قریب ہونے کا نام نہیں لیتی۔ اس کے مقابلہ میں بامقصد اور مثبت فکر کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس کا ہر ہر قدم اسے منزل سے قریب سے قریب تر لے جاتا ہے۔ آزادیِ فکر کے بانتیجہ ہونے کیلئے لازمی ہے کہ غور و فکر کرنے والے کے سامنے ایک نشانِ منزل موجود ہو تاکہ وہ شمعِ فکر کی روشنی میں راہ کی رکاوٹوں سے بچتا ہوا وہ منزلِ مقصود پر گامزن ہو سکے جس راہی کے سامنے کوئی نشانِ منزل ہی نہ ہو اسے منزل کیسے مل سکتی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم اور ہمارے راہنما آزادیِ فکر کے ساتھ ساتھ ہماری نوجوان نسل کو نشانِ منزل بھی بتائیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کو بروئے کار لانے سے پاکستان کی نئی نسل کو فکری بے راہ روی سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ اور نئی نسل کی فکری بے راہ روی کو ختم کئے بغیر معاشرہ سے توڑ پھوڑ، اخلاق باختگی، اور لاقانونیت کا خاتمہ کرنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

والسلام

(۰)

(۱۱)

مقبولاتِ الٰہی

اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف ایک ہی چیز ہے جو انسان کو دیگر اشیائے کائنات سے ممیز کرتی ہے اور وہ ہے اُس کی قوتِ فکر۔ اگر اُس کے اندر یہ قوتِ فکر نہ ہوتی تو وہ بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ایک شے ہوتا۔ اور بس۔ نہ ہی وہ کائنات کے صاف و سادہ صفحات پر کسی قسم کی مصوری کرنے کے قابل ہوتا اور نہ ہی فطرت کی ہیبت ناک قوتوں کو مسخر کر کے اُن سے نئی دنیائیں تعمیر کرنے کے اہل۔ اور یہ جہانِ رنگ و بو جہانِ بے رنگ و بے بو ہو کر رہ جاتا کیونکہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

لیکن اُس کی یہ قوتِ فکر و شعور اُس کے لئے وجہِ امتیاز صرف اُس وقت بنتی ہے جب اُس کو اسے استعمال کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہو۔ اُس پر کسی قسم کا جبر و اکراہ نہ ہو۔ انسانوں کی وضع کردہ کوئی پابندی نہ ہو۔ بصورتِ دیگر اس صلاحیت کے وجود کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ بلکہ اگر اس کے برعکس اُس کی فکر کو کسی طرح غلام بنا لیا جائے تو بعض اوقات وہ حیوانیت کی سطح سے بھی پست سطح پر چلا جاتا ہے۔ آپ نے کبھی کسی گدھے کو کسی مٹی کے ڈھیر یا پتھر کی چٹان کے سامنے ماتھا رگڑتے یا گڑگڑاتے نہیں دیکھا ہوگا۔ لیکن انسانی فکر کو جب مغلوب کر لیا جائے تو وہ اپنے ہاتھوں سے ہی سنگ و خشت کی مختلف صورتیں بنا کر اُن کے آگے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے اُن لوگوں کے متعلق جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے کہا کہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ کہ وہ حیوانوں کی طرح ہی نہیں اُن سے بھی گمراہ تر ہیں۔ غرض انسان کے شرفِ انسانی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اُسے فکر کی کامل آزادی حاصل ہو۔ اُس کی فکر پر کسی قسم کا خارجی یا داخلی دباؤ نہ ہو۔ قرآن نے آکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اُس کی فکر کو معبودانِ باطل کے خوف سے آزاد کیا۔ اُس کے اوہامِ باطل کی زنجیروں کو توڑا۔ اس نے مذہبی پیشوائیت کی اُن سلوں کو توڑا جنہوں نے فکرِ انسانی کو اپنے بوجھ تلے کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس نے قدم قدم پر یہ اعلان کیا۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ - اَفَلَا تَشْعُرُوْنَ - اَفَلَا تَتَدَبَّرُوْنَ۔ تمہارے پاس عقل، فکر، تدبر کی صلاحیتیں ہیں کیا تم اُن سے کام نہیں لیتے۔ اس نے اُن تمام اغلال و سلاسل کو جنہوں نے انسان کے دل و دماغ کو اپنے اندر جکڑ رکھا تھا۔ ایک ہی ضرب میں یہ کہہ کر پاش پاش کر دیا۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اسے ضابطۂ قوانین، حکومت، اور نبوت بھی حاصل کیوں نہ ہو کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم اور فرماں پذیر بن جاؤ۔

کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کی فکر پر پابندی لگانا تو ایک طرف رہا خود خالقِ کائنات نے بھی کسی انسان کی فکر پر پابندی لگانے کا فیصلہ نہیں کیا۔ اُس نے انسان کو راہِ ہدایت سمجھائی تو بس اتنا ہی کیا کہ راستہ دکھا دیا۔ اور کہا کہ یہ صراطِ مستقیم ہے۔ اُسے مجبور نہیں کیا کہ لازماً اُسی راستے پر چلو بلکہ اسے اس بات کی پوری پوری آزادی دی کہ جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے اور جس کا جی چاہے دوسرا راستہ اختیار کرے۔ فرمایا۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔ اُس نے اپنے رسول سے کہا۔ ان سے کہہ دیجئے کہ میں تمہارے اختیار و ارادہ کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تمہیں اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ تمہاری فکر کو سلب نہیں کرتا۔ بلکہ علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ تم اس پر عقل و فکر کی رو سے غور و فکر کرو، علم و بصیرت کی روشنی میں پرکھو۔ اگر تم اس طرح اس کی صداقت سے مطمئن ہو جاؤ تو قلب و دماغ کی رضامندی سے اس کا اعتراف کرلو۔ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۔ اس نے مومن کی بہت بڑی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اور تو اور جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں۔ تو ان پر بھی اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گر پڑتے۔

غرض قرآن نے انسانی فکر پر پڑے ہوئے تمام قفل توڑ ڈالے۔ اس نے اس کی فکر کو تمام پابندیوں سے آزاد کرکے آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا۔

آج انسان نے اس بات کو سمجھ لیا ہے کہ آزادئ فکر اس کا بنیادی حق ہے۔ اُسے اس بات کا شعور پیدا ہو گیا ہے کہ آزادئ فکر کے بغیر اس کا شرفِ انسانیت باقی نہیں رہتا۔ آجکل اس بات کو ایک مسلّمہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے کہ آزادئ فکر انسان کا بنیادی حق ہے۔ بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ افراط و تفریط کے چکر کے تحت اس بات پر کچھ ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یا یوں کہئے کہ آزادئ فکر پر تو زور دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ لازمی شرط یعنی پختگئ فکر کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادئ فکر انسان کے شرفِ انسانیت کی بنیاد ہے۔ لیکن اگر اُس کے اندر کھرے کھوٹے کو پہچاننے کی صلاحیت نہ ہو تو یہی آزادئ فکر اس کے حق میں سمِ قاتل بن جاتی ہے۔ تیز دھار چھری کو اگر بچے کے ہاتھ میں دیدیا جائے تو اس سے اُس کی اپنی جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ صنوبر کو آزاد فضاؤں میں جھومنے کے لئے مضبوط جڑ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ دھڑام سے نیچے آگرے گا۔ کشتی کو کھلے پانی میں چھوڑنے کے لئے لنگر کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر اُس کا توازن برقرار نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح انسانی فکر کو بھی ایک مضبوط بنیاد کی ضرورت ہے اور یہ بنیاد مستقل اقدار و قوانینِ خداوندی ہیں۔ اگر مستقل اقدار و قوانین خداوندی کی مضبوط بنیاد نہ ہو تو آزادئ فکر کا نتیجہ سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں ہوتا کیونکہ ذہنِ انسانی کی یہ بنیادی کمزوری ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی ذات کے مفاد کے لئے سوچتا ہے اور جب اس کے مفادات خواہ وہ انفرادی سطح پر ہوں یا اجتماعی سطح پر دوسرے انسانوں سے ٹکراتے ہیں تو نتیجہ لازماً فتنہ و فساد ہوتا ہے اور پھر انسان انسان نہیں رہتا حیوانیت کی سطح پر اتر آتا ہے۔

ذرا مغرب کی طرف نظر کیجئے۔ یہ آزادئ افکار ہی کا نتیجہ ہے کہ باوجود ہر قسم کی مادی آسائشوں کے ذہنی سکون نام کو نہیں۔ علم و ہنر کی انتہائی بلندیوں پر ہونے کے باوجود یہ قومیں شرفِ انسانیت سے محروم ہیں۔ آئے دن قومی اور انفرادی سطح پر ان کے ہاں حیوانیت کے بے شمار مظاہر نظر آتے ہیں۔ مغرب کی اسی کیفیت کو پیشِ نظر رکھ کر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

آزادئ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

دور جانے کی کیا ضرورت ہے اپنے ملک میں ہی دیکھ لیجئے۔ ہمارے ملک کا واحد باشعور طبقہ جس پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہے اور پوری قوم کی نگاہیں جس پر لگی ہوئی ہیں یعنی طالب علم طبقہ کی کیفیت کیا ہے۔ آئے دن تعلیمی اداروں میں ہنگامے، ہڑتالیں، سڑکوں پر توڑ پھوڑ، گھیراؤ جلاؤ، خون ریزی، قتل و غارت، قومی املاک کا اپنے ہاتھوں نقصان، اپنے ہاتھوں سے اپنی درسگاہوں کو تباہ کرنا یہ سب کس بات کی غمازی کرتے ہیں۔ کیا یہ زندہ تفسیر نہیں ہے اس کی کہ ؎

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ انہیں آزادیٔ فکر تو دے دی گئی ہے لیکن پختگیٔ فکر نہیں دی گئی۔ اس کی کشتیٔ فکر کو وہ لنگر نہیں دیا گیا جس سے اس کا توازن برقرار رہ سکے۔ اس کی فکر کے تناور درخت کے لئے وہ مضبوط جڑ مہیا نہیں کی گئی جس کے سہارے وہ آزاد فضاؤں میں گھوم سکے۔ اسے مغربی علوم کے میخانے سے سیراب تو کیا گیا ہے لیکن سوزِ لا الٰہ نہیں دیا گیا۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

کھلے ہیں سب کے لئے غربیوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں

آج ہمارے نوجوان طالب علم کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ کوئی محکم بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے اندرونی یا بیرونی خیالات و تصورات کا جو بھی ریلا آتا ہے خس و خاشاک کی طرح اسے بہائے لئے چلا جاتا ہے۔ کبھی وہ ملک کی مفاد پرست سیاسی جماعتوں کا آلۂ کار بنتا ہے اور کبھی غیر ملکی ایجنٹوں کا۔ کوئی کمیونزم پر فریفتہ ہے اور کوئی مادہ ازم کا دیوانہ۔ اور کسی کی آزادیٔ فکر نے اسے صوبائی آزادی و خود مختاری کی منزل دکھائی ہے۔ جذبات کا یہ عالم ہے کہ ذرا سی آنچ ہوتی ہے تو یہ گھاس پھوس کے ڈھیر کی طرح بھڑک اٹھتا ہے اور اپنی ہی متاعِ عزیز یعنی قومی املاک کو بھسم کر کے خاموش ہو جاتا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس نوجوان کی فکر کو قرآن کی اساسِ محکم مہیا کی جائے اور اسے یہ درس دیا جائے کہ ؎

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی!
مزی چو خس کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

--- (۰) ---

(۱۴)

خالد سلام

صاحب صدر! معزز خواتین و حضرات!

اس موضوع کو سرسری نگاہ سے دیکھ کر آجکل کی نوجوان نسل کے ہمارے ساتھی طنز اور استہزا سے یہ کہہ اٹھے ہونگے کہ لو بھئی، اب طلوعِ اسلام کی اسٹیج سے یہ منصب سنبھالا جا رہا ہے کہ جو کام فرسودہ ذہن مولوی کے بس کا نہ

رہا تھا وہ انہوں نے "اقبال" اور "قرآن" کے سہاروں سے شروع کر دیا۔ خدا خدا کر کے ملا کے کابوس سے چھٹکارا ملنے لگا تھا کہ اب آزادیٔ افکار کو مطعون کر کے انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ کیا یہی بات ہے جو ہم کہنا چاہتے ہیں؟ کیا رجعت پسندوں کے ٹولے کا اس سٹیج پر قبضہ ہو گیا ہے۔ جو اب ایسی بات کہی جا رہی ہے؟

بات سمجھنے کے لئے "آزادیٔ افکار" اور "فکرِ خام" کے مفہوم کو سمجھ لینا ہوگا۔

صاحبِ صدر! مختلف نظام ہائے حیات کو دیکھا جائے تو ان میں سے ایک ایسا سامنے آتا ہے کہ جہاں فکرِ انسانی کو مصلوب کر کے رکھا گیا تھا۔ یہ وہ نظام ہے جسے تھیاکریسی یا "مذہب" کا نظام کہا جاتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ پاکستان جب بنا تو قائد اعظمؒ نے خصوصاً اعلان کیا تھا کہ یہاں تھیاکریسی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مذہب کے متعلق پرویز صاحب نے اپنی کتاب "کتاب التقدیر" میں یہ کہا ہے کہ یہ بات بالکل مبنی برحقیقت ہے کہ مذہب وہ افیون ہے جسے سرمایہ پرستوں نے غریبوں کو مدہوش رکھنے کے لئے ایجاد کر رکھا ہے۔ آخر غریبوں کو کب تک مدہوش رکھا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے مذہب کی بنیاد میں اس تعلیم کو سمو دیا گیا کہ عقل و فکر کو بالکل کام میں نہ لاؤ۔ اور جب عقل کو کام میں نہ لایا جاوے تو یہ بات بھی چلتی ہے کہ رزق کو خدا کا عطیہ سمجھا جائے کہ وہ جسے چاہے زیادہ دے، جسے چاہے کم دے۔ (یاد رکھئے مذہب سے مراد دنیا کے مروجہ مذاہب ہیں جو انسانوں کے خود ساختہ ہیں۔ اس سے مراد قرآن کا وہ نظام نہیں جو خدا کا دیا ہوا الدین ہے اور جو مذہب کے خلاف ایک کھلا ہوا چیلنج ہے)۔

جہاں تک رزق کا تعلق ہے جب لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا تھا تقسیمِ رزق کا مسئلہ محض نظری حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن جب رزق کی تنگی عام ہو جائے تو بھوکے مجبوراً سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کیا ہے کہ امیر آدمی کے کتے کو وہ کچھ مل رہا ہے جو غریب کے بچے کو میسر نہیں۔ جب ان سے کہا جاتا کہ "یہ تو خدا کی مرضی ہے اور تقدیر میں ایسا لکھا ہے" تو آخر تنگ آ کر ایک دن وہ ایسے خدا کو سات سلام کر دیتے ہیں کہ یہ خدا ہے جو انسان کے بچے کو پیدا تو کرے لیکن اس کے بعد اس کو پیٹ بھر کر کھانے کو نہ دے۔

اس طرح تھیاکریسی کے خلاف ردِ عمل کے طور پر آزادیٔ افکار کا اعلان ہوا لیکن یاد رہے کہ عقل کو یہ آزادی تاریخ میں ایک لمبی کشمکش اور خوفناک تصادمات کے بعد حاصل ہوئی۔ مثلاً یورپ کو جب علمی ترقی کا خیال آیا تو "مذہب" ان کی راہ میں سب سے بڑا روڑہ تھا۔ کلیسا نے آزادیٔ افکار کی کس قدر مخالفت کی' اس کا اندازہ لگانا ہو تو یورپ میں مذہب اور سائنس کے ٹکراؤ کی داستانیں پڑھیے۔ معلوم ہو جائے گا کہ جس قدر درندگی اور سفاکی کا سلوک عیسائیت کی ان معصوم بھیڑوں نے علم و فکر کی آزادی چاہنے والوں کے ساتھ کیا (وہ غیر ہی نہیں اپنے تھے) قتل و خون کی بڑی سے بڑی خونچکاں داستان بھی اس کے سامنے شرمندہ ہے۔ یہ مذہب (جو حضرت عیسیٰؑ کی آسمانی تعلیم نہیں بلکہ محرف شدہ تھی) زندگی کے ہر شعبے پر مسلط تھا۔ علم و بصیرت کا دشمن، عقل و فکر کا حریف اور سائنٹیفک سوچ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ — دنیا سے نفرت اور ہر مادی علائق سے قطعِ تعلق' اس کے بنیادی ستون تھے۔ ظاہر ہے کہ مذہب (دین نہیں مذہب) اسی وقت تک ہی چل سکتا ہے جب تک انسان علم و عقل سے کام نہ لے اور اپنے مقامِ انسانیت سے بے خبر رہے۔ عقل و شعور کی بیداری کے بعد ایسے مذہب کے خلاف ردِ عمل لازمی تھا۔

ہمارے ہاں جو کچھ مذہب کے نام سے آجکل مروج ہے وہ ہمارے اس دور کی پیداوار ہے جب ملوکیت، سرمایہ داری، اور پیشوائیت کا دور دورہ تھا اور کچھ جوڑ توڑ ہوتی گئی ہے۔ لہٰذا جن عناصر کا مجموعہ دنیا کے دیگر مذاہب ہیں وہی اس کے بھی اجزائے ترکیبی ہیں۔ جب دیگر مذاہب کا وہ حشر ہوا جس کا ذکر کیا گیا ہے تو ہمارا خود ساختہ اسلام، اس رو سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس کے زوال کا باعث یہ نہیں کہ اس کا پیش کرنے والا ان پڑھ ملا ہے۔ اسے اگر پڑھا لکھا طبقہ پیش کرے تو بھی یہ باقی نہیں رہ سکتا کیونکہ مذہب میں باقی رہنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ اس کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہے۔ یہ تو صرف خدا کے عطا فرمودہ دین کی خصوصیت ہے کہ وہ ہر زمانے کا ساتھ دیتا اور انسانی فکر کی امامت کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔

عقل کو جب تک مصلوب کر کے رکھا گیا تو انسانیت پر جمود طاری رہا اور اس کی تہذیب پر بانجھ پن --- آزادئ افکار کے نعرے کے صدقے جب اس نے اس جمود سے گلو خلاصی حاصل کی تو کم از کم مادی ترقی نے تو اس کے قدم چومے۔ عقلِ انسانی کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے ہی انسان کو اپنے ماحول پر سب سے بڑی فتح عطا کی۔ ماحول سے نمٹنے کے لئے انسان نے عقل کی مدد سے ہتھیار اور اوزار بنائے اور کائناتی قوتوں کو تابعِ تسخیر کرتا چلا گیا۔

زندگی نام ہے حرکت اور روانی کا۔ جہاں جمود طاری ہوا زندگی ختم ہو گئی۔ ارتقاء فطرت کا اٹل قانون ہے اور ارتقاء کے لئے جہدِ مسلسل اور سعئ پیہم ناگزیر ہے۔ آگے وہی بڑھتا ہے جو چلتا ہے سکوت اور موت مترادف ہیں قرآن کے الفاظ میں:

بیٹھا رہنے والا، چلنے والے کے اور اندھا، آنکھوں والے کے برابر نہیں ہو سکتا۔

انسان جو غاروں سے نکل کر چاند پر کمندیں ڈالنے کے قابل ہوا ہے تو اسی لئے کہ اس نے منہ پر سے پڑے ہوئے پردے نوچ ڈالے اور حرکتِ پیہم کو اپنا شعارِ زندگی بنایا۔ جن قوموں نے سوچنا شروع نہیں کیا وہ بدستور غاروں والی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ قرآن کریم نے قوموں کو اس سہل انگاری سے نکالنے کے لئے اپنی دعوت میں تَتَفَکَّرُوْا "سوچا کرو" کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی اس دعوتِ انقلاب کو قبول کرنے اور عملاً اختیار کر لینے کا نتیجہ تھا کہ عربوں جیسی پسماندہ قوم چند سال کے عرصے میں امامتِ عالم کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہو گئی۔ ان عربوں میں اور ایران اور روم کی عظیم سلطنتوں کی مالک اقوام میں فرق کیا تھا۔ یہی کہ وہ قومیں اپنے فرسودہ خیالات، اسلاف پرستی کے پامال راستوں اور رسومِ کہن کی مقدس لاشوں کے ساتھ چمٹی ہوئی تھیں اور ان عربوں نے حرکت اور حرارت میں زندگی کا راز پا لیا تھا۔ لیکن خواتین و حضرات، مسلمانوں کی آزادئ افکار کا تصور دوسروں کی آزادی سے مختلف ہے۔ دوسروں کا آزادئ افکار سے مراد مادر پدر آزادی ہے۔ اس قسم کی آزادی کو اقبالؒ ابلیس کی ایجاد کہہ کر پکارتا ہے۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ وہی ہے جو سفر اور آوارگی میں ہوتا ہے۔ دونوں میں قدم اٹھتے ہیں، راستہ طے ہوتا ہے، وقت اور توانائی صرف ہوتی ہے، کام کاج کا حرج ہوتا ہے لیکن ان میں صرف اس قدر فرق ہے کہ سفر میں چلنے والے کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے اور اس کا ہر قدم اس منزل کی جانب اٹھتا ہے۔ اس کے برعکس آوارگی میں چلنے والے کے سامنے کوئی منزل متعین نہیں ہوتی۔ اس کا قدم کسی خاص سمت کی طرف نہیں اٹھتا۔ لہٰذا "فکرِ خام" یا آوارگی دونوں ہم معنی ہیں یعنی سفر بلا تعینِ منزل۔ انسانی زندگی، تعینِ منزل اور حرکتِ پیہم سے عبارت ہے۔ اگر فکر خام ہے تو

آزادیٔ افکار ایسی ہی ہے جیسے (بقول برقو) "سمندروں میں طالع آزمایانہ جہاز رانی تو کی جائے لیکن پاس نہ کمپاس ہو نہ مقناطیس۔ یہ ایسے ہی ہوگا جیسے اجنبی سرزمینوں کی تلاش میں روانگی لیکن سمت سفر متعین کرنے کا کوئی ذریعہ پاس نہ ہو۔"

اس میں شبہ نہیں کہ فکرِ انسانی نے ہر طرف چلنے میں بڑی کد و کاوش کی ہے۔ اس نے طالع آزمایانہ پروازیں، گہرائیوں اور بلندیوں میں ہر طرف کی ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کی فکر کا ماحصل ایک بڑی سطحی سی بات ہے کہ

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب!
موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

اس نظریہ نے انسان کے اپنے مقامِ بلند کو بھی پستیوں میں گرا دیا۔ اس سے انسان ایک مشین بن کر رہ گیا یا زیادہ سے زیادہ ایک حیوان۔ اور انسانی تگ و تاز کا مقصد کسی نہ کسی طرح اپنے حیوانی جذبوں کی تسکین رہ گیا۔ نہ کوئی بلند نصب العین رہا نہ کوئی درخشندہ اقدار۔ اس کے نتیجے میں دو عالمی جنگیں، ویٹ نام، بنگلہ دیش کا المیہ وغیرہ وغیرہ انسانیت کے سامنے آئیں اور تیسری عالمگیر جنگ کی طرف یہ چلا جا رہا ہے۔ زندگی بلا مقصد، مستقبل تاریک، مایوسی کے اندھیرے۔۔

ظاہر ہے کہ جب صورتحال یہ ہو کہ انسان کے پاس بے پناہ قوتیں آجائیں اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ خود کیا ہے اور اس کی زندگی کا منتہا کیا، تو وہ قوتیں اور کیا نتیجہ پیدا کر سکتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس قسم کی فکر، اسی قسم کا انسان ۔۔ مادی ترقی انسانی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے، اس کے بغیر انسان عالمِ طبیعات میں اسی مقام پر رہ جاتا ہے جہاں سے کاروانِ حیات نے اپنا سفر شروع کیا تھا لیکن جب مادیت (آزادیٔ افکار کا ماحصل) بجائے خویش تصورِ حیات بن جائے تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ وہی جو ہمارے دور کا کلچر ہے جس کو اقبالؒ نے تہذیبِ فرنگ کی اصطلاح سے پکارا ہے۔ اور کل آپ عزیزم نسیم انور کے انگریزی کے مقالہ میں اس کی روح فرسا تفاصیل سن چکے ہیں کہ اس نے انسان کے ساتھ کیا کیا۔ فکرِ فرنگ نے تمام اقدار کا مذاق اڑایا۔ اس نے ان تمام اصولوں کا مذاق اڑایا جو "مذہب" کے نام سے منسوب تھے۔ اس میکانکی تصورِ حیات کی رو سے چونکہ تمام کائنات اور خود انسان ایک مشین کی طرح کام کرتے ہیں، اس لئے اس نظریہ کے مطابق سوچنے والا انسان رفتہ رفتہ خود بھی ایک مشین بن جاتا ہے جس میں حرکت تو ہوتی ہے لیکن لچک نہیں ہوتی۔ صلابت تو ہوتی ہے لیکن لوچ باقی نہیں رہتی۔ فنونِ لطیفہ سے ان کی دلچسپی بالعموم جنسی جذبات کی تسکین کے لئے ہوتی ہے جن کی شدت مادی نظریۂ حیات اور تھکا دینے والی مشینی زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔

امریکن سوسائٹی میں انسان کی صورتِ حال پر کتابیں وہاں کے اندر سے ابھرتی رہتی ہیں۔ پہلے شائع ہونے والی ایک کتاب کے ٹائیٹل سے تو آپ واقف ہی ہیں- (THE LONELY CROWD)- اب حال ہی میں وہاں سے ایک اور کتاب شائع ہوئی ہے جس نے امریکن نئی نسل پر اپنے تبصرہ کو اس کے ٹائیٹل کے دو الفاظ میں سمو کر رکھ دیا ہے۔

THE UNCOMMITTED,

THE ALIENATED YOUTH (By KENNETH KENISTON)

وہی معاملہ بقول قرآن:

تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّ قُلُوبُهُمْ شَتّٰى۔ بظاہر ایک جگہ جمع لیکن دل الگ الگ

میکانکی نظریۂ حیات نے مغرب کو اس قسم کا معاشرتی نظام عطا کیا۔ خارجی دنیا کے مسائل تو اس نے حل کر دیئے۔ لیکن انسانوں کے باہمی معاملات کا کوئی تسلی بخش حل اس سے دریافت نہ ہو سکا۔ درحقیقت یہ بات اس کے بس کی تھی ہی نہیں۔ یہی وہ شعبہ ہے جس میں اس تہذیب کی پوری ناکامی سامنے آجاتی ہے۔ انسانوں کے مل جل کے رہنے کے معاملات کا حل پیش کرنا اس کے لئے ناممکن ہے۔

انفرادیت کے رجحانات سے بچنے اور معاشرے میں جذب ہونے کے لئے جن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے مثلاً باہمی مودت، ایثار، خلوص، احسان، مروت، جھکاؤ، سپردگی، دوسروں کے جذبات کی رعایت۔۔۔ ان سب کا تعلق انسان کی حیاتِ لطیفہ سے ہے۔ حسابی قاعدوں اور منطقی مفروضوں سے نہیں۔ اس مسئلہ پر لکھتے ہوئے مفکرِ قرآن جناب پرویز نے لکھا ہے کہ

میکانکی نظریۂ حیات سے فکری تصورات تو پیدا ہو سکتے ہیں لیکن اس سے اُن جذبات و احساسات کی نمود نہیں ہوتی جو عمق قلب سے ابھرتے اور افقِ تصورات پر چھا جاتے ہیں اور جنکی صحت و سقم پر تہذیب کے حق و باطل ہونے کا مدار ہوتا ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ خارجی حوادث کے خلاف کسی قوم کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے؟ .... اگر خارجی حوادث کے خلاف ردِ عمل ہمیشہ ایک سمت کی طرف ہو تو وہ قوم مستقل اقدار کی حامی ہوگی۔ اگر ہر حادثہ کے خلاف ردِ عمل مختلف ہو تو اس قوم کا معیارِ عمل مصلحت کوشی اور مفاد بینی ہوگا جس کے فیصلے تنہا عقل کی رو سے کئے جاتے ہیں۔ اور اگر خارجی حوادث کے خلاف کسی قوم کا ردِ عمل کچھ بھی نہ ہو تو اس قوم پر تصوف کی موت طاری ہو جاتی ہے۔ جسے عام اصطلاح میں مذہب کہتے ہیں .... یہ ردِ عمل متعین کیسے ہوتا ہے؟ اس قوم کے معتقدات سے! اور معتقدات ہمیشہ یقین سے پیدا ہوتے ہیں اور یقین کی عمارت مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار ہو سکتی ہے۔ میکانکی نظریۂ حیات، چونکہ مستقل اقدار کے وجود سے ہی انکار کرتا ہے اسلئے اس کی دنیا میں یقین کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مادیت کا لازمی نتیجہ ریب و تشکیک ہوتا ہے۔ زندگی کی اقدار پر یقین ہٹ جانے سے قلبِ انسانی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے کوئی اور جذبہ پُر نہیں کر سکتا۔ اسلئے بے یقینی کا لازمی نتیجہ پریشانی اور اضطراب ہے"

(انسان نے کیا سوچا۔ صفحہ ۳۱۴)

آدم بمیرد از بے یقینی۔

اس طرزِ زندگی سے دل کی توانائی اور ذہن کی پاکیزگی تو ختم ہوتی تھی، اس کے ساتھ جسمانی صحت بھی تباہ ہو گئی۔ امریکن نژاد یا امریکی پسند نئی نسل کا کوئی ہی فرد ہوگا جو ہپی نہ ہو گیا ہو اور افیون، ماکٹ طیا اس سے بھی زیادہ تیز نشے نہ کرتا ہو۔ امریکہ کی سیاحت سے واپسی پر لوگوں کا عام تاثر یہ ہوتا ہے کہ "عصر حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔

اندھے حوادث کے مقابلے میں خوف سے ہراساں۔ اپنے اندر کی دنیا میں جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے

بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں؟

دنیا کے اکثر مفکر اس بات سے لرزاں و ترساں ہیں کہ اگر تیسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی تو انسانوں کا وجود تک باقی نہیں رہیگا۔ یہ ہے مادیت کا پھل ۔۔ آزادیٔ افکار کا یہ ماحصل درحقیقت اصل ادراکِ حقیقت میں انسان کی فکر کی عجز و واماندگی کا اعتراف ہے۔

اندریں حالات، اب انسانیت اسے AFFORD ہی نہیں کر سکتی کہ دنیا عقل کے تجرباتی طریق کی سست روی کو اپناتے ہوئے وحدتِ انسانیت کی منزل تک پہنچے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان اقوام کو قرآن کی تعلیم سے روشناس کرایا جائے تاکہ وحی کی راہ نمائی میں اس منزل تک جلد از جلد پہنچ جائیں اور عالمگیر انسانیت اس تباہی سے بچ جائے جو بصورتِ دیگر اسکی تقدیر مبرم نظر آتی ہے۔

(۰)

(۱۴)

غلام صابر

صاحبو، ساتھیو، بھائیو، بہنو اور صدر ذی وقار!

زیرِ بحث موضوع میں جو اصولی بات کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ سوچ اور فکر ہی وہ موثر اور عظیم ذریعہ ہیں جس کے ذریعے انسان کو حیوان اور حیوان کو انسان بنایا جا سکتا ہے، یعنی اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ

ہو سچتہ اگر فکر تو آزادیٔ افکار
حیوان کو انسان بنانے کا طریقہ

دوستو! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ فکرِ انسانی کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور، جسے دورِ پرستش کہتے ہیں، AGE OF WORSHIP دوسرا دور طلسماتی دور (AGE OF MAGIC)، تیسرا دور عقل کا دور (AGE OF REASON) چوتھا دور سائنس کا دور (AGE OF SCIENCE) اور پانچواں دور، دورِ معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے۔ ان ادوار میں انسان نے مختلف رویے اپنائے جو آج ہماری اجتماعی اور انفرادی نفسیات کا بڑا حصہ ہیں۔ مثلاً دورِ پرستش، دراصل انسان کو خوف کے ذریعے تبدیل کرنے کا عمل تھا۔ دورِ طلسم میں انسان دہشت کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا تھا۔ انسان بڑی قربانیوں کے بعد عقل و شعور کے دور میں آیا اور دورِ طلسم اور دورِ پرستش کے بڑے بڑے مقدس سورماؤں نے اس کے خلاف بڑی بڑی سازشیں کیں، عقل و فکر پر پہرے بٹھائے اور اس کا نام مذہب رکھ دیا۔ اس طرح کاروانِ انسانیت آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر دورِ سائنس میں داخل ہوا۔ مذہب والوں نے تو عقل و فکر پر صرف پہرے بٹھائے تھے لیکن اس دور میں انسانی عقل اور فکر کو سرے سے ہی دیس نکالا دیدیا اور انسان کو محض ایک مشین سمجھ کر اس کی مضمر صلاحیتوں کو محض پیداواری قوت بنا دیا گیا۔ یعنی عقل و فکرِ انسان کو پہلے رات کے اندھیروں میں دبایا جاتا تھا اور اب سورج کی کرنوں کی موجودگی میں اسے نیست و نابود کیا جانے لگا۔ قتل و غارت اور ظلم کی اس صورتِ حال نے دوسرا رُخ اختیار کیا اور چند انسانوں کی فکر کو تمام انسانیت پر زبردستی اور ظالمانہ طور پر مسلط کرنے کی مہم شروع ہوئی۔

یہ دورِ معاشیات کا دور کہلاتا ہے۔ اس میں چند انسانوں کو غور و تدبر، سوچ اور فکر کی آزادی — لیکن تمام انسانوں کی آزادیِ فکر پر پہرے بٹھا دیئے گئے — یعنی قانون کی حکومت تو قائم کی گئی لیکن اس قانون کی اصل ظلم، لالچ، اور خود غرضی پر تھی۔ اس طرح آج تک فکرِ انسانی نے انسانیت کو جن نتائج سے روشناس کرایا ہے وہ خوف، دہشت، لالچ اور خود غرضی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس تسلسل میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ آج کے دور میں جو سوچ اور فکر انسان کو خوف، دہشت، لالچ اور مشینی طور پر بہلے گی اُس کے نتائج ذلت و گمراہی اور حیوانیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ !!

بدقسمتی یہ ہے کہ آج اسلام کے نام لیوا، انسان کو دورِ طلسم اور دورِ پرستش کے پرانے اندھیروں میں لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی کے نئے تقاضوں سے بے بہرہ ہیں — وہ فکرِ انسانی کے ماضی کی پوجا کرنے میں نجات کے متلاشی ہیں۔ اُن کے افکار کو پھلنے پھولنے کے لئے مفاد پرست گروہ نے کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ وہ اس کو مقدس بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ پوری طرح آزاد ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ انسانوں کو حیوانیت کے قعرِ مذلت میں گرانے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

صاحبِ صدر! خوف اور دہشت سے پیدا شدہ افکار و خیالات، ظالموں اور لٹیروں کی معاونت کرتے ہیں۔ دوسروں کی محنت پر عیش کرنے والے گروہ ایسے افکار کی حوصلہ افزائی ہی نہیں کرتے۔ وہ انسان کو حیوان بنے رہنے میں آزادی تو دیتے ہیں لیکن ایسی سوچ اور فکر پر پہرے بٹھا دیتے ہیں جو انسان کو حیوانیت سے نکال کر معراجِ انسانیت کی پُربہار وادی میں لے آئے جہاں انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جہاں ہر انسان کا انسان ہونے کی جہت سے احترام ہو۔ رنگ، نسل اور وطن کی تنگناؤں سے نکال دے کہ یہ تو دورِ طلسم اور دورِ پرستش کی یادگاریں ہیں۔

دورِ طلسم اور دورِ پرستش کے پیشواؤں، ہم خیالوں اور ہم فکروں نے ہمیشہ اُن پیغمبرانہ جدوجہد کرنے والوں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں، مصائب و آلام کے پہاڑ کھڑے کئے۔ جو انسان کو شعبدہ بازی، ساحرانہ طریقِ زندگی کے خام فکری کے بھنور سے نکال کر قوانینِ فطرت اور احکامِ الٰہی سے روشناس کرانے تھے۔ فریبی، لٹیرے اور ظالم اپنی لوٹ کھسوٹ میں آزاد رہنے کے لئے، ایسے افکار ہی کو نیست و نابود کر دیتے ہیں جو حیوانوں کو انسان بنائیں اسی لئے راہبانہ اور صوفیانہ طریقِ زندگی، ظالموں کا ساتھ دینے کے مرادف ہے۔

صاحبِ صدر! اس میں شبہ نہیں کہ زندگی ایک جوئے رواں ہے اور اس میں حق و باطل کی کشمکش کا طویل سلسلہ جاری ہے۔ آج دورِ سائنس کے مشینی عمل سے مایوس ہو کر جب فکرِ انسانی اقدار کی جانب منتقل ہوتا ہے تو وہ دراصل طلسماتی اور پرستش، لالچ اور خود غرضی کے مفاد پرستانہ رویہ کو چھوڑ رہا ہوتا ہے۔ ظالموں کو اس میں اپنی موت نظر آتی ہے۔ وہ نہایت عیاری سے نعرہ لگاتے ہیں کہ "قرآن کی طرف واپس لوٹو" (GO BACK TO QURAN) بظاہر یہ نعرہ بڑا مقدس نظر آتا ہے لیکن دراصل وہ اپنی "طلسماتی" اور ظالمانہ ذہنیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں — یہ خود فریبی میں اندھے ہو چکے ہیں۔ یہ اتنے بڑے ظالم ہیں کہ قرآن کی آیات کو بھی بدل دیتے ہیں۔ ان کی تفسیر اور تفہیمِ قرآنی ظالموں اور لٹیروں کے مفادات کی محافظ ہے۔ فکرِ انسانی کی تاریخ میں یہ گروہ ظالمین کی پہلی قطار میں ہے۔

انہیں یہ کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ یہ کہیں کہ فکرِ انسانی نے صدیوں کے تجربات کے بعد انسانیت جس مقام پر آ پہنچی ہے اُس سے آگے بڑھیں ۔۔۔ قرآن کے ساتھ آگے بڑھو — GO FORWORD WITH QURAN — کیونکہ قرآن تو کتابِ مبین ہے ۔ وہ نہ صرف ایسی روشنی ہے جو صحیح منزل کا تعین کرتی ہے بلکہ اس کے نور کی کرنیں تو اُس کی جانب قلبِ سلیم لے کر آنے والوں کے لیے آنکھوں کا نور بن جاتی ہیں۔

صاحبِ صدر! ظالموں کا بہت بڑا ہتھکنڈہ یہ ہے کہ قرآن کو ہاتھ میں لے کر قرآن کی مخالفت کی جائے اور طلسماتی اور پرستش کی ذہنیت سے راہبانہ اور متصوفانہ طرزِ زندگی کو "اسلامی نظام" کہہ دیا جائے۔ تفسیروں کا طویل سلسلہ اس بات کا شاہد ہے ۔ اور اس طرح یہی سوچ اور فکر، انسان کو حیوان بناتی چلی جاتی ہے۔ اقبالؒ نے اسے نہایت خوبصورتی سے یوں بیان کیا ہے کہ

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

صاحبِ صدر! ہمارے ملک کو مفاد پرستانہ سوچ اور ظالمانہ فکر نے کہاں لا کھڑا کیا ہے اس کو دیکھنے کے لئے کسی افلاطون کی ضرورت نہیں ۔صورتِ حال یہ ہے کہ آج ہم خود سے بیگانے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ اور خون کی ارزانی ہیں سرخ فضا کی دہشت ہے ۔ہر شخص پاگل نظر آتا ہے ۔خوف کی حکمرانی ہے ۔شعور و لاشعور پر درندگی کا سایہ ہے ۔ ذہن سیاہ بادلوں کی مانند فضا میں بے منزل راہی ہے ۔ کبھی برستا ہے یا دہشت کے طوفان میں برسے جانے پر مجبور ہوتا ہے ۔ اس کے قطروں میں بھی اپنوں کا خون ٹپک رہا ہے ۔ یہ خون کبھی خاکی وردی کا گھیراؤ کرتا ہے اور کبھی چاول سے پیٹ بھرنے والے جسموں کی سیاہی کو آگ کے شعلوں میں اس طرح اُبالتا ہے کہ یہ ہندوؤں کے ناؤ و نوش کے سہام نہ سکے ۔ یہ منظر نادیدنی ہے ۔ دہشت میں خون کی ارزانی کبھی اس طرح نہ ہوئی تھی۔

کوئی آغاز نہ انجام نہ منزل نہ سفر
سب وہی دوست ہیں دہرائی ہوئی باتیں ہیں

ہماری فکر، دہشت کا سایہ ہے ۔ہماری سوچ خون کا دریا ہے جس میں ہم خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بہنوں، ماؤں اور بیٹیوں کو غرق کر رہے ہیں ۔ اس میں شبہ ہے کہ ہمارا رشتہ اُس فکر سے ہے جو لوگوں کو اُن کی بیٹیاں زندہ در گور کرنے سے باز رکھتی تھی ۔ ہم صرف بیٹیوں کو نہیں اپنی ماؤں، بہنوں کے خون اور اُن کی عصمتوں کو دہشت کے خونی دریا میں خود اپنے ہاتھوں سے پھینک رہے ہیں۔

یہ منظر زندہ در گور کرنے سے بھی زیادہ اذیت ناک ہے! یہ زیادہ گھناؤنا ہے! یہ منظر نادیدنی ہے ۔ اس ہولناک جیرانی رقص میں، اگر اس کا دیا ہے اور اگر کوئی چراغِ راہ ہے تو وہ صرف یہ کہ ہم دہشت سے اپنے آپ کو بدلنے کی روایت کو توڑیں ۔ اس روایت کو توڑنے کا ایک ہی راستہ ہے ۔ ایک ہی صراطِ مستقیم ہے اور وہ عالمگیر اقدارِ قرآنی پر یقین ۔۔۔ ! اور یقین ایسا کہ ہمیں خود پر قرآن نازل ہوتا دکھائی دے ۔ جو لوگ قرآن کا نام لیتے ہیں وہ خوب ہیں، لیکن عجیب بھی، اس لیے کہ آسمانی بلندیاں اُن کا سرچشمہ ہیں لیکن یہ قوسِ قزح کے رنگوں میں غرق ہیں، برسے ہوئے بادلوں میں بجلیوں کی تمنا رکھتے ہیں ۔ مختلف رنگوں کے وقتی بھنور میں مدہوش ہیں ۔ اور پھر ہر ذہن چاندی کی لو

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

حقائق و عبر

۱۔ کام آخر جذبۂ بے اختیار آہی گیا

تشکیلِ پاکستان کے بعد جب ۱۹۴۹ء میں، آئین سازی کا مرحلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے قرارداد مقاصد کا مسودہ مرتب ہوا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ :-

> تمام کائنات پر اقتدار مطلق (ساورنٹی) صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور ان نے جو اختیارات ملت پاکستانیہ کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو تفویض کئے ہیں وہ ایک مقدس امانت ہیں جنہیں خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر استعمال کیا جائے گا۔

مذہبی پیشوائیت نے اس پر مسرت کے شادیانے بجائے۔ سب سے زیادہ اظہار انبساط جماعت اسلامی کی طرف سے ہوا۔ جس نے کہا کہ اس قرارداد کے پاس کرنے سے "مملکت مسلمان ہو گئی ہے"۔ جماعت اسلامی کی طرف سے اس ردعمل کی تہہ میں ایک سیاسی مصلحت پوشیدہ تھی۔ مودودی صاحب ہندوستان میں کہتے رہے تھے کہ پاکستان کی مملکت کافرانہ ہوگی۔ بلکہ اس سے بھی بدتر۔ جب ان کی مخالفت کے باوجود پاکستان وجود میں آگیا اور یہ خود اس کی طرف بھاگ کر آ گئے تو انہیں اقتدار مملکت کو اپنے ہاتھ میں لینے کی سوجھی۔ اپنے سابقہ رویہ کے پیش نظر ان کے لئے اس قسم کا کوئی اقدام مشکل تھا۔ اس لئے وہ اس تاک میں تھے کہ اس کے لئے کوئی گنجائش نکال لی جائے۔ قرارداد مقاصد کے پاس کرنے پر انہوں نے اس مملکت کے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور اس طرح اپنے لئے اقتدار مملکت حاصل کرنے کے دروازے کھول لئے۔ بہرحال جماعت اسلامی ہو یا دیگر مذہبی جماعتیں اس قرارداد پر ہر ایک نے ہدیہ تبریک و تحسین پیش کیا۔ ان کے برعکس طلوع اسلام نے اس پر کڑی تنقید کی۔ اور کہا کہ اس سے خدا کا وہ تصور ہی مسخ ہو جاتا ہے جو اسلام کا اصل الاصول اور دین کی اساس ہے اس نے کہا تھا کہ :-

> کانسٹی ٹیوشن کی رو سے جب کوئی قوت اپنے اختیارات کسی دوسرے کو تفویض (DELEGATE) کر دیتی ہے تو جب تک وہ ان اختیارات کو واپس نہ لے وہ اختیارات اس کے پاس نہیں رہتے۔ اس سے لازم آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جو اختیارات مملکت پاکستان کو تفویض کر دیئے ہیں وہ اس وقت اللہ کے پاس نہیں رہے۔ خدا کے متعلق اس قسم کا تصور بالکل غلط ہے۔ یہ تصور عیسائیوں کے پوپ (POPE) کا پیدا کردہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ خدا نے اپنے اختیارات انہیں تفویض کر دیئے ہیں۔ لہٰذا ان کا حکم خدا کا حکم ہے وہ خدائی اختیارات کے مطابق انسانوں پر حکومت کرنے کا حق رکھتے ہیں اس کا نام "خدائی حقوق" تھا۔

اور اس اندازِ حکومت کا نام تھیاکریسی ...... اسلام نے اس برہمنیت کو مٹا دیا۔ (قرآنی دستورِ پاکستان صفحہ ۱۴)

اس تنقید کے بعد طلوعِ اسلام نے اپنی طرف سے مسودہ قرارداد پیش کیا۔ جس میں کہا گیا کہ:۔

مسلمانوں کی وجہِ جامعیت اسلام ہے اور یہی تصورِ حیات ہے جس کی بنا پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے تاکہ اس مملکت کے باشندے اسی خصوصی تصورِ حیات کے مطابق جس میں اختیارِ حکمرانی کو ایک مقدس امانت قرار دیا گیا ہے حدود اللہ کے اندر آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنے اختیارات کا استعمال کرے۔ (ایضاً صفحہ ۹۴)

طلوعِ اسلام کی یہ آواز منفرد تھی۔ پورے پاکستان میں کسی نے بھی اس کی تائید نہ کی۔ لیکن اسے تو صرف ایک گوشے کی تائید مطلوب ہوتی ہے اور وہ گوشہ ہے خدا کی کتاب "قرآنِ عظیم" کا۔ اسے اس کی تائید حاصل تھی۔ اس لئے وہ اس آواز کو برابر دہراتا رہا۔ تا آنکہ سنہ ۱۹۵۶ء کے دستور کی تدوین کا مرحلہ سامنے آ گیا۔ اس وقت بھی یہ نکتہ کسی مولوی صاحب کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ قراردادِ مقاصد کا متعلقہ حصہ اسلام کے یکسر خلاف ہے البتہ مسٹر چندریگر (مرحوم) کی سمجھ میں وہ بات آ گئی جسے طلوعِ اسلام باصرار و تکرار پیش کئے چلا آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ "تفویض" کے لفظ سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی تھیں اس لئے قرارداد کے اس فقرہ کو یوں بدل دیا گیا ہے۔

"تمام کائنات پر اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کا ہے اور اس کی متعین کردہ حدود کے اندر جو اختیارات ملتِ پاکستانیہ استعمال کرے گی وہ ایک مقدس امانت ہیں۔"

یہ فقرہ سابقہ قرارداد کے مقابلہ میں بہرحال بہتر تھا۔ لیکن ان دونوں فقروں میں جسے "اور" کے ساتھ ملا دیا گیا تھا کوئی معنوی ربط نہیں تھا۔ (ملاحظہ ہو طلوعِ اسلام فروری سنہ ۱۹۵۶ء صفحہ ۶)

سنہ ۱۹۶۲ء کے آئین میں بھی اس فقرہ کو سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے مطابق علیٰ حالہٖ رہنے دیا گیا۔ لیکن جب موجودہ حکومت نے شروع سنہ ۱۹۷۳ء میں موجودہ مسودۂ آئین پیش کیا تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس میں اسی قراردادِ مقاصد کو دہرایا گیا ہے جو سنہ ۱۹۴۹ء میں پاس ہوئی تھی۔ یعنی۔

تمام کائنات پر اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس نے جو اختیارات ملتِ پاکستانیہ کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو تفویض کئے ہیں وہ ایک مقدس امانت ہیں جنہیں خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر استعمال کیا جائے گا۔

اس پر ہم نے پھر اپنی اسی تنقید کو دہرایا جسے ہم نے سنہ ۱۹۴۹ء کی قرارداد کے سلسلہ میں پیش کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو طلوعِ اسلام بابت فروری سنہ ۱۹۷۳ء) مولوی صاحبان نے اس دستور کے خلاف متحدہ محاذ تو کھڑا کر دیا اور اپنی سینکڑوں ترامیم بھی پیش کیں لیکن قراردادِ ... کے ان الفاظ کے لئے کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ طلوعِ اسلام بہرحال اپنے موقف کو دہراتے چلا گیا۔ بارے الحمد کہ اس کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہوئی اور اس مسودہ کی دوسری خواندگی کے وقت مولانا کوثر نیازی صاحب نے مجوزہ قرارداد میں ترمیم پیش کی اور اخبارات میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق انہوں نے کہا۔

یہ ترمیم اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے پیش کی جا رہی ہے جو اسلامی عقیدہ وحدانیت کے سلسلہ

میں طویل عرصہ سے چلی آرہی تھی اور ۱۹۴۹ء کی اصلی قراردادِ مقاصد اور سابقہ آئین میں بھی لگاتار یہی غلطی نظر انداز ہوتی رہی۔ انہوں نے کہا کہ مسودۂ آئین کے دیباچہ اور سابقہ آئین کے دیباچوں میں یہ الفاظ موجود ہیں "کل کائنات پر واحد حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو اس کے عوامی نمائندوں کے ذریعہ منتقل کی ہے کہ وہ اس اختیار کو اللہ تعالیٰ کی متعین کردہ حدود کے اندر رہ کر استعمال کریں۔ جو ایک مقدس فریضہ ہے" مولانا کوثر نیازی نے کہا کہ مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی قادرِ مطلق اور احکم الحاکمین ہے۔ وہ اپنی حاکمیت اور قدرت کسی غیر اللہ کو منتقل نہیں کرتا۔ اس لئے سابقہ دیباچہ غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حاکمیت عوام کو منتقل کر دی ہے۔ بعض لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت غیر اللہ کو منتقل کر دی ہے۔ اور یہی مفہوم غلطی پر مبنی ہے۔ چنانچہ پیش کردہ ترمیم اس غلطی کے ازالے کے لئے ہے۔ انہوں نے کہا کہ علما بھی غیر ارادی طور پر اس غلطی کا اعادہ کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن یہ مرتبہ پیپلز پارٹی ہی کے نصیب میں تھا جسے "کافروں کی جماعت" کہا جاتا ہے کہ اس غلطی کو درست کرائے۔ (نوائے وقت ۴/اپریل ۱۹۷۳ء)

ہم ان تسامحات سے صرف نظر کرتے ہوئے جو مندرجہ بالا تقریر میں موجود ہیں برسرِ اقتدار پارٹی کو بہرحال مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے پیش کردہ مسودہ کی ایسی اصولی غلطی کا احساس کر کے اس میں خود ہی ترمیم کر دی۔ اس مبارکباد کی توضیح ہم پہلی اس وقت کریں گے جب منظور شدہ قرارداد کے الفاظ ہمارے سامنے آئیں گے۔ طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ جس بات کو وہ اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق حق سمجھے اسے بلا خوفِ ملامت و ترہیب اعلانیہ پیش کرے۔ اور خواہ اس کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہو۔ اس پر استقامت سے قائم رہے۔ وہ ایسا اس یقین کے سہارے کرتا ہے کہ فضا کتنی ہی ناسازگار کیوں نہ ہو حق آخر الامر کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ اس قسم کے واقعات اس کے اس یقین کی شہادت بن جاتے ہیں۔ سابقہ دساتیرِ پاکستان میں بھی اور موجودہ مسودۂ دستور میں بھی اور بھی کئی امور ایسے ہیں جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے قابلِ تنسیخ یا ترمیم طلب ہیں۔ ہم شروع سے ان کی نشاندہی کرتے چلے آرہے ہیں۔ زیرِ تدوین آئین کے مسودہ پر تبصرہ کرتے وقت بھی ہم نے انہیں نمایاں کیا تھا۔ آئین منظور ہو کر سامنے آجائے تو ہم پھر دیکھیں گے کہ ان میں کون کون سی شقوں میں اصلاح کر لی گئی ہے۔ اور کون کون سے اسقام ہنوز باقی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آئین ۱۰/اپریل تک مکمل ہو جائے گا۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ پرچہ کی اشاعت کی تاریخوں کی پابندی کی وجہ سے ہم زیرِ نظر شمارہ میں اس پر تبصرہ نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے قارئین کو زحمتِ کشِ انتظار ہونا پڑے گا۔

۲۔ آزادیٔ افکار

۲۳/مارچ کا دن پاکستان کی ملی تاریخ میں بڑا عظیم دن ہے۔ اس دن (آج سے ۳۳ سال پہلے) ملتِ اسلامیہ نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ ہم ایک ایسی آزاد مملکت قائم کریں گے جس میں ہم اپنے نظریاتِ ملی (یعنی مستقل اقدارِ خداوندی) کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اسی دن ملک میں متعدد تقاریب منائی جاتی ہیں اور اخبارات اپنے خاص نمبر

نکالتے ہیں۔ اس سلسلہ میں روزنامہ پاکستان ٹائمز (لاہور) نے بھی اپنا خاص نمبر شائع کیا۔ لیکن دیکھئے کہ اس خاص تقریب پر اس خصوصی نمبر میں وہ گل کیا کھلاتے ہیں۔ اداریہ میں لکھتے ہیں:۔

> ہمیں اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ پاکستان کا اصلی تصور جسے پاکستان ریزولیشن سنہ ۱۹۴۰ء میں پیش کیا گیا تھا دو آزاد (SOVEREIGN) مملکتوں یا وحدتوں کا تصور تھا۔

اس گمراہ کن فریب انگیز نظریہ کی تہہ میں کتنی بڑی سازش پوشیدہ ہے اسے ہم متعدد بار بالوضاحت بیان کر چکے ہیں۔ کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ ملک کا ایسا شہرت یافتہ جریدہ ۲۳ مارچ کے دن اس کا اعادہ کر رہا ہے۔ سنہ ۱۹۴۰ء ریزولیشن کے مفہوم کی رو سے ایک پاکستان متصور تھا یا دو الگ الگ آزاد مملکتیں۔ یہ سوال بھی اب بحث طلب نہیں رہا۔ یہ حقیقت بڑی دلچسپ ہے کہ اس اخبار کی اسی اشاعت کے ضمیمہ میں "جناح۔ گاندھی خط و کتابت" پر مشتمل ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر گاندھی نے قائد اعظم سے دریافت کیا تھا کہ:۔

> "کیا (مجوزہ) پاکستان کے دو حصوں میں الگ الگ آزاد مملکتیں ہوں گی؟"
>
> اس کے جواب میں قائد اعظم نے لکھا تھا۔
>
> "نہیں۔ وہ ایک ہی مملکت پاکستان کی دو وحدتیں ہوں گی۔"

ہم پوچھتے ہیں محترم مدیر پاکستان ٹائمز سے کہ سنہ ۱۹۴۰ء ریزولیشن کا مفہوم قائد اعظم بہتر سمجھتے تھے یا آپ (ان سے بھی) بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

اور اگر آپ کے نزدیک اس باب میں قائد اعظمؒ کی تشریح سند کی حیثیت نہیں رکھتی، تو (کم از کم) صدرِ مملکت مسٹر بھٹو کی تشریح تو قابلِ تسلیم ہوگی۔ وہ اپنی معرکہ آراء تصنیف (THE GREAT TRAGEDY) کے صفحہ اول پر رقمطراز ہیں:۔

> ہمارا نقطۂ آغاز سنہ ۱۹۴۰ء ہے جب ۲۳ مارچ کو مسلمانانِ ہند نے قائد اعظمؒ کے زیرِ قیادت پاکستان کا مطالبہ کیا۔۔۔ یعنی برصغیر میں ایک الگ آزاد مملکت کا مطالبہ۔ یہ مطالبہ اس ریزولیشن میں درج تھا جسے لاہور ریزولیشن کہا جاتا ہے اور جسے فضل الحق صاحب نے جنہیں شیرِ بنگال کہہ کر پکارا جاتا تھا، پیش کیا تھا۔ گذشتہ چند سالوں میں اس ملک کے دو بازوؤں میں باہمی مناقشت کی وجہ سے اس ریزولیشن سے متعلق ایک تلخ سی بحث کا از سرِ نو آغاز کر دیا گیا ہے۔ پہلے سنہ ۱۹۶۶ء میں شیخ مجیب الرحمٰن نے اور پھر مولانا بھاشانی نے کہا کہ لاہور ریزولیشن میں دو آزاد مملکتوں کا تصور موجود ہے۔ ایک مشرقی بازو میں، ایک مغربی میں۔
>
> یہ لاہور ریزولیشن کی دیانتدارانہ تعبیر نہیں۔ (طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

ہمیں امید ہے کہ صدرِ مملکت کے ان ریمارکس کے بعد ہمیں مدیر پاکستان ٹائمز کی خدمت میں کچھ اور عرض کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

اور آگے چلیئے۔ مملکتِ پاکستان کی بنیاد نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریہ پر ہے۔ اگر ان نظریات کو نظر انداز کر دیا جائے تو پاکستان کے (ہندوستان سے الگ) ایک آزاد مملکت بننے یا قائم رہنے کی وجہ جواز ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ ہے ان نظریات کی اہمیت۔ لیکن سنیئے کہ (بزعمِ خویش) قوم کا یہ نمائندہ قوم کو کیا سبق پڑھاتا ہے۔ اس اداریہ میں لکھا ہے۔

> یہ مرکزی حقیقت ہے کہ پاکستان کی فنا اور بقا کا انحصار فلسفیانہ مباحث پر نہیں عمل پر ہے۔۔۔ اس کا انحصار ان نظریات کے متعلق غوغا آرائی کرنے والے مبلغین پر نہیں عوام پر ہے۔ کوئی شخص نظریۂ پاکستان

یا دو قومی نظریہ کی نظری سطح پر کچھ ہی کیوں نہ کہے یہ واضح حقیقت ہے کہ باشندگان پاکستان اپنے قومی تشخص کو کسی حالت میں بھی گنوا دینے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

اور آگے بڑھیئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریک پاکستان کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسلام نے ایمان کی بنیاد پر ایک الگ امت کی تشکیل کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس میں ناکام رہا۔ اب اسی ناکام تجربہ کو دہرانا حماقت ہے۔

ایچ۔ کے۔ برکی صاحب ایک مشہور صحافی ہیں جو سیاسیات پر اکثر و بیشتر لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا ایک مقالہ اسی پاکستان ٹائمز کی ۱۵ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ وہ "اشتراکِ دین کی بنیاد پر تشکیلِ قومیت کے تصور کی مخالفت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

> پہلے مذہبی پیشواؤں کا خیال یہ ہے کہ مسلمان دنیا کے کسی حصے میں بستے ہوں ایک ملت کے افراد ہیں۔ مولانا مودودی اور دیگر (علماء) نے قائداعظمؒ کی مخالفت میں جو دلائل پیش کئے تھے ان میں ایک دلیل یہ بھی تھی۔

ان ہمہ دانی کے مدعیوں کو کون بتائے کہ

(۱) یہ خیال کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک امت کے افراد ہیں مذہبی پیشواؤں کا وضع کردہ نہیں۔ یہ اسلام کا بنیادی اصل اور خود خدا کا پیش کردہ معیار ہے۔ اور

(۲) مذہبی پیشوا ایسے قائداعظمؒ کی مخالفت اس بنا پر کی تھی کہ قائداعظمؒ دین کے اشتراک کو معیار قومیت قرار دیتے تھے۔ اور نیشنلسٹ علماء وطن کے اشتراک کو معیار قومیت۔ جہاں تک مودودی صاحب کا تعلق ہے ان کی مخالفت کا جذبہ اپنے لئے مرکزی مقام اور آخرالامر اقتدار کا حصول تھا۔

بہرحال یہ ہے نمونہ ہماری صحافت کا جو اٹھتے بیٹھتے آزادیٔ افکار کی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔ یعنی ایسی آزادی جس پر کسی اصول یا قدر کی پابندی نہ ہو۔ یہی وہ آزادی ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ

اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک — جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ — آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

---(۰)---

۲۔ خدا کے مقربوں کی نشانیاں

لاہور میں حال ہی میں "میلہ چراغاں" منعقد ہوا۔ یہ میلہ درحقیقت مشہور بزرگ "مادھو لال حسین" کے عرس کی تقریب کے سلسلہ میں منعقد ہوتا ہے۔ روزنامہ نوائے وقت کی ۲ اپریل کی اشاعت میں حضرت مادھو لال حسینؒ کے متعلق ایک تعارفی مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ۔۔۔ ایک خدا رسیدہ بزرگ ۔۔۔ اس میں تحریر ہے۔

نور احمد چشتی مرحوم "تحقیقاتِ چشتیہ" میں لکھتے ہیں کہ ایک واقعہ کے بعد شاہ حسین نے طریقہ ملامتیہ اختیار کر لیا۔ ڈاڑھی منڈوا ڈالی۔ تمام احکاماتِ شریعت کو بالائے طاق رکھ کر رقص و موسیقی

کی محفلوں میں بیٹھنے لگے اور شراب نوشی شروع کر دی۔ ان عادات و اطوار پر لوگ انہیں ملامت کرتے لیکن وہ لوگوں کی لعن طعن سے بے نیاز اپنے حال میں مست رہتے۔ کسی نے شاہ حسین کی ان عادات و اطوار کی خبر ان کے استاد حضرت شیخ بہلول کو کر دی۔ آپ چنیوٹ سے لاہور تشریف لائے تاکہ شاہ حسین کی اصلاح کی جائے اور پھر سے اُسے راہِ راست پر لایا جائے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب انہوں نے شاہ حسین سے گفتگو کی تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہ عاداتِ قبیحہ کا شکار نہیں بلکہ برگزیدگی کی منزل طے کر رہے ہیں۔

یہ ہیں وہ بزرگ جن کا دعوےٰ (مولانا روم کے الفاظ میں) یہ ہوتا ہے کہ

ما ز قرآں مغز را برداشتیم ۔۔۔ استخواں پیشِ سگاں انداختیم

اور یہی ہیں وہ بزرگ جن کی قبروں تک کی پرستش ہوتی ہے۔

کچھ عرصے سے حضرت شاہ حسین، "اشتراکیین" میں کافی مقبول ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً ان کی "برگزیدگی" کی وہی منزلیں ہیں جنہیں وہ اس طرح طے فرمایا کرتے تھے۔

ذرا سوچئے کہ جس قوم کو اس سطح پر پہنچا دیا گیا ہو وہ کبھی انسانی صفوں میں کھڑے ہونے کے قابل ہو سکتی ہے!

یہ امت خرافات میں کھو گئی!

(۵)

۴۔ پرائیویٹ اور پبلک ضابطۂ اخلاق

مغرب کی مادی (خدا فراموش) تہذیب نے دنیا کو جو انسانیت سوز نظریات عطا کئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ پرائیویٹ زندگی کے لئے ضابطۂ اخلاق اور ہے اور پبلک لائف کے لئے اور۔ یہ ثنویت نہ صرف یہ کہ بڑی تباہ کن ہے بلکہ نفسیاتی طور پر باطل بھی ہے۔ کیریکٹر نام ہے خارجی واقعات کے متعلق انسان کے برجستہ ردِ عمل کا۔ "برجستہ" اس لئے کہ جو عمل "دو اور دو چار" کے حساب کتاب کے بعد متعین کیا جائے اسے مصلحت اندیشی کہا جائے گا کیریکٹر نہیں۔ سو جب کیریکٹر خارجی واقعات کے متعلق انسان کے برجستہ ردِ عمل کا نام ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ خارجی واقعہ گھر کے اندر ظہور پذیر ہوا ہو یا بازار میں۔ اس کا تعلق افرادِ خاندان سے ہے یا بین الاقوامی مجلسِ سیاست سے۔ لیکن کیریکٹر کا مغربی معیار یہ کہتا ہے کہ پرائیویٹ زندگی اور پبلک لائف کے لئے معیار الگ الگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اقوام میں جن مشاہیر کے مجسمے کھڑے کئے جاتے ہیں، ان کی پرائیویٹ لائف پر جھانک کر دیکھئے تو وہ انتہائی متعفن نظر آئے گی۔ اس کی تازہ مثال حال ہی میں اخبارات کی ایک خبر سے سامنے آئی ہے۔ روزویلٹ، امریکہ کا نہایت ممتاز صدر تھا۔ بین الاقوامی شہرت کا مالک۔ دنیا اُسے عزت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ حال ہی میں اس کے بیٹے نے، اس کے سوانح حیات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ (صدر) روزویلٹ کے اپنی پرائیویٹ سیکرٹری مس بی ہینڈ (LEHAND) کے ساتھ باقاعدہ جنسی تعلقات تھے اور یہ سلسلۂ اختلاط روزویلٹ کی بیوی کی رضامندی سے طے پایا تھا۔ جب مس لی ہینڈ بعارضۂ فالج بستر گیر ہو گئی تو روزویلٹ نے ایک اور عورت سے تعلقات وابستہ کر لئے۔ اسی سلسلہ میں اس کتاب میں ایک اور عجیب واقعہ بھی لکھا ملتا ہے۔ جوزف کینیڈی جس زمانے میں برطانیہ میں امریکہ کا سفیر تھا، اس کے ایک انجیرس کے ساتھ ناجائز تعلقات

تھے (صدر) روزویلٹ نے اس سے کہا کہ یہ بُری بات ہے۔ وہ ان تعلقات کو منقطع کرے۔ اس نے جواب میں کہا کہ آپ
لی ہینڈ سے تعلقات منقطع کریں میں اس ایکٹرس کو چھوڑ دوں گا ۔۔۔ آں خانہ ہمہ آفتاب بود ۔۔۔

(بحوالہ۔ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۱۸ اپریل ۷۳ ۱۹ء)

یہ ہیں عصرِ حاضر کے مشاہیر کی پرائیویٹ زندگیوں کے حالات۔ قرآن کریم کسی فرد کی پرائیویٹ زندگی اور پبلک زندگی میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک جس شخص کی پرائیویٹ لائف مذموم ہے وہ پبلک لائف میں بھی کسی عزت کا مستحق نہیں ہوتا۔ اسی تعلیم کا یہ غیر شعوری اثر ہے کہ ہمارے معاشرہ میں اس قدر خرابیاں پیدا ہو جانے کے باوجود ابھی تک کیفیت یہ ہے کہ ارباب اقتدار میں سے کوئی شخص امورِ حکومت یا قومی کاموں کے سلسلہ میں کتنے ہی شاندار کارنامے کیوں نہ سرانجام دے، اگر اس کے پرائیویٹ کیریکٹر پر کوئی دھبہ نظر آ ئے تو عوام کی نظروں میں اس کی کوئی عزت نہیں رہتی۔ خدا کرے کہ یہ رجحان ہمارے ہاں قائم رہے۔

(٠)

۵۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں .....

پاکستان ٹائمز بابت ۱۸ مارچ ۱۹۷۳ء میں ذیل کی حیرت انگیز خبر شائع ہوئی ہے۔

> لنڈن کے اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" میں پیٹر گل کے قلم سے یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ دس اور پندرہ ہزار کے درمیان بنگالی جن میں بہت سے سول آفیسر بھی ہیں، پاکستان سے فرار ہو کر بنگلہ دیش پہنچ چکے ہیں۔ پاکستان میں قریب بارہ ہزار بنگالی سول ملازمین ہیں۔ ان میں سے اس وقت تک نصف کے قریب بنگلہ دیش پہنچ چکے ہیں۔ یہ لوگ قبائلیوں کو رشوت دے کر افغانستان پہنچ جاتے ہیں جہاں سے بھارتی ڈپلومیٹس انہیں نئی دہلی یا ڈھاکہ روانہ کر دیتے ہیں۔

اگر یہ خبر صحیح ہے اور اس کا ابھی تک کوئی تدارک نہیں ہوا ہے، تو ہم جو امید لگائے بیٹھے ہیں کہ مجیب اور نہیں تو کم از کم اپنے بنگالیوں کے بدلے میں ہمارے قیدیوں کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے گا، تو ہماری امیدوں کا یہ دیا بھی رفتہ رفتہ بجھ جائے گا۔

۶۔ یہ بھی ہماری ہی کوشش کا نتیجہ ہے

آئین سازی کے سلسلہ میں جو تعطل پیدا ہو گیا تھا، اور حزبِ مخالف نے ایک متحدہ محاذ بنا کر جس طرح مجلسِ آئین ساز کا بائیکاٹ کر رکھا تھا اس سے قوم کے حساس قلوب وقفِ صد اضطراب تھے کہ نہ معلوم اب یہ بد نصیب ملک کسی نئی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہے۔ ہماری قوم نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ بالکل آخری دن حزبِ اختلاف کے ارکان اسمبلی میں تشریف لے آئے اور اس طرح آئین متفقہ طور پر منظور ہو گیا۔ قوم ارباب اقتدار کے اس مبارک اقدام پر انہیں مستحق تبریک قرار دیتی تھی۔ جماعتِ اسلامی خود حزبِ اختلاف کے متحدہ محاذ میں شامل تھی لیکن آئین کے مسئلہ پر جو تعطل پیدا ہو گیا تھا اخبارات میں یکا یک

حسب ذیل خبر شائع ہوگئی۔

جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا مودودی نے کہا ہے کہ میں نے آئین کے مسئلہ پر اتفاق رائے کی کوششوں میں مدد دے کر اپنا مذہبی فرض ادا کیا ہے۔ انہوں نے یہ الفاظ آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم کے ایک تار کے جواب میں کہے ہیں۔ سردار قیوم نے مولانا مودودی کے نام ایک تار میں کہا تھا کہ آئین سازی کے آخری مرحلہ میں اتفاق رائے پیدا کرنے کے لئے آپ نے جو کوششیں کی ہیں' ان پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(امروز - ۱۲ اپریل)

لیکن اسے سوئے اتفاق کہیئے یا کچھ اور کہ اس اخبار کے اسی کالم میں جس میں مندرجہ بالا خبر شائع ہوئی، حسب ذیل خبر بھی سامنے آگئی۔

وزیر اعلیٰ معراج خالد نے کہا ہے کہ حزب مخالف صدر بھٹو اور وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ کے ساتھ براہِ راست مذاکرات کے بعد قومی اسمبلی میں واپس آئی تھی اور یہ کسی دوسری شخصیت کی مؤثر مداخلت کا نتیجہ نہیں ہے آج راولپنڈی سے لاہور پہنچنے پر اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عبدالحفیظ پیرزادہ صوبائی گورنر ملک غلام مصطفےٰ کھر کے ساتھ ملاقات کی غرض سے لاہور آئے تھے لیکن انہوں نے جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا مودودی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ عبدالحفیظ پیرزادہ نے اپنے ٹیلیویژن انٹرویو میں بتایا کہ میں اور گورنر اپوزیشن لیڈروں سے ملاقات کے لئے لاہور جاتے رہے لیکن مولانا مودودی سے ہم نے کوئی ملاقات نہیں کی۔

قومی اسمبلی میں حزب مخالف کے رکن مولانا ظفر احمد انصاری نے ان خبروں کو غلط قرار دیا ہے کہ وہ مرکزی وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ کو لے کر مولانا مودودی کے مکان پر گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس خبر میں کوئی صداقت نہیں کہ میں مرکزی وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ یا کسی دوسرے وزیر یا حکومت کے کسی نمائندہ کو ساتھ لے کر مولانا مودودی کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک غلط تاثر کو دور کرنے کے لئے یہ بیان دے رہا ہوں۔ مولانا ظفر احمد انصاری نے کہا ہے کہ مجھے اس بات کا بھی کوئی علم نہیں ہے کہ کوئی وزیر یا حکومت کا کوئی ترجمان مولانا مودودی سے حال ہی میں ملا تھا۔

اربابِ اقتدار لاکھ تردیدیں چھاپتے رہیں۔ مودودی صاحب نے جو کچھ کرنا تھا وہ کر گزرے۔ اب جماعتِ اسلامی والے یہ سرگوشیاں کرتے پھر رہے ہیں کہ مولانا صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے حقیقت وہی ہے۔ "یوسوس فی صدور الناس" ان حضرات کا پرانا حربہ ہے۔

(پکڑ)

انتقالِ پُر ملال

ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ بزم طلوعِ اسلام کراچی کے ہر دلعزیز نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا ہے۔ ادارہ محترم موصوف کے اس غم میں ان کا برابر کا شریک ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق۔

شریکِ غم: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - لاہور